گریٹ انڈین سرکس

خوش ونت سنگھ

ترجمہ: محمد عثمان سعید

خوش ونت سنگھ

ترجمہ: محمد عثمان سعید

نگارشات

24- مزنگ روڈ ○ لاہور۔ FAX:7354205 PH:0092-42-7322892

حبیب ایجوکیشنل سنٹر 38۔ مین اردو بازار لاہور PH:042-7240593

e-mail:nigarshat@yahoo.com

"Notes On Great Indian Circus"

Written By:

Khuswant Sing

Translated By:

Muhammad Usman Saeed

Published By:

Asif Javed

نام کتاب: گریٹ انڈین سرکس

مصنف: خوش ونت سنگھ

ترجمہ: محمد عثمان سعید

ناشر: آصف جاوید

برائے: نگارشات پبلشرز 24 - مزنگ روڈ لاہور

PH:0092-42-7322892 FAX:7354205

حبیب ایجوکیشنل سنٹر 38۔ مین اردو بازار لاہور

PH:0092-42-7240593 FAX:7354205

کمپوزنگ: آزاد کمپوزنگ سنٹر لاہور 042-7598311

مطبع: المطبعۃ العربیہ لاہور

سال اشاعت: 2005ء

قیمت: =/180 روپے

321

فہرست

❖ ... دوسرا حصہ .... واقعات اور حوادث 75

❖ ... تیسرا حصہ .... آئینے کے رُوبرو 107

❖ ○ ❖

ابتدائیہ

پاکستان اور پاکستانی

بھارت کے معروف صحافی' نامور ادیب اور کالم نگار سردار خوشونت سنگھ جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں پاکستان کے مطالعاتی دورے پر دہلی سے بذریعہ پی آئی اے لاہور تشریف لائے تھے یہاں سے وہ اپنے آبائی گاؤں ہڈالی (Hedali) گئے اور پھر واپس آ کر زندہ دلان لاہور کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ پاکستان میں قیام کے دوران ممتاز سکھ صحافی بے شمار پاکستانیوں سے ملے' گھوم پھر کر شہر کو دیکھا اور لوگوں کے تاثرات قلم بند کیے اور واپس دلی پہنچ کر پاکستان کے بارے میں اپنے کئی تاثراتی کالم لکھے اور ایک بھارتی جریدے کو طویل انٹرویو دیا جس میں انہوں نے پاکستان کے اس وقت کے حالات' سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی عوام میں مقبولیت اور پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن آنسہ بے نظیر بھٹو کی پوزیشن اور جنرل ضیاء کے بارے میں ان کے ذاتی تاثرات کے ساتھ ساتھ دونوں ہمسایہ ممالک کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات و خیالات نہایت دلچسپ اور شگفتہ انداز میں بیان کیے۔ ذیل میں خوشونت سنگھ کے انٹرویوز کے بعض اہم اور دلچسپ اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں لیکن اقتباسات کے مطالعہ سے قبل سردار خوشونت سنگھ جی کے بارے میں کچھ باتیں جو اہم انکشافات پر مبنی ہیں' سن لیجیے۔

خشونت سنگھ......مختصر تعارف!

بھارت کے ممتاز قلم کار' معروف صحافی اور منفرد کالم نگار سردار خشونت سنگھ جتنی شہرت کے حامل ہیں ان کی آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ بیگم سشما شہرت کی روشنی میں آنے سے

اتنا ہی پرہیز کرتی ہیں۔ پچھلے دنوں پاکستان کے مطالعاتی دورے کے بعد واپس دلی پہنچ کر موصوف نے پاکستان کے بارے میں ایک تاثراتی سفرنامہ لکھا اور ایک معروف بھارتی اخبار کے لیے اپنا انٹرویو قلم بند کرایا۔ انٹرویو کا بیشتر حصہ پاکستان کے بارے میں خوشونت کی ذاتی رائے اور گہرے تاثرات پر مبنی ہے۔ قبل اس کے کہ آپ پاکستان کے بارے میں سردار صاحب کے تاثرات سے آگاہی حاصل کریں' نہایت اختصار سے سردار خشونت سنگھ جی کے بارے میں جان لیں۔ خشونت سنگھ جی نے اپنے انٹرویو میں اپنی ذات کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں بتایا۔

''...... میں روزانہ علی الصبح ساڑھے چار بجے سو کر اٹھتا ہوں۔ باروچی خانے میں جا کر اپنے لیے بغیر شکر کی کورین چائے تیار کرتا ہوں ایک کپ خود پیتا ہوں اور دوسرا کپ اپنے اس سیکورٹی گارڈ کو پیش کرتا ہوں جو رات بھر جاگ کر مجھے شر پسندوں کے شر سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے بعد بی بی سی کی خبریں سنتا ہوں اور پھر صبح کا ''ہندوستان ٹائمز'' دیکھتا ہوں۔ سات بجے جم خانہ کلب میں جا کر ٹینس کے دو سیٹ کھیلتا ہوں پھر گھر واپس پہنچ کر شاور لیتا ہوں۔ انتہائی سخت سردی میں بھی اپنا یہ معمول کبھی متروک نہیں کرتا۔ شاور لینے سے جسم میں چستی اور نکھار سا آ جاتا ہے اور میری جلد چمکنے لگتی ہے۔

''شاور کے بعد میں پھر دوسرے تمام اہم اخبارات کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد ناشتہ جس میں چائے اور ٹوسٹ لیتا ہوں۔ صبح کے وقت میں کبھی کسی ملاقاتی سے نہیں ملا کرتا۔ البتہ فون کی گھنٹی بجنے پر اسے ضرور سن لیتا ہوں اور اس طرح پوری یکسوئی کے ساتھ دوپہر کے کھانے تک مسلسل لکھتا رہتا ہوں۔ دوپہر کے کھانے میں صرف سوپ کا ایک پیالہ اور دہی لیتا ہوں کبھی کسی کی دوپہر کے کھانے کی دعوت قبول نہیں کرتا۔ کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کرتا ہوں جو صرف آدھے گھنٹہ کا ہوتا ہے۔ اس طرح میں ایک بار پھر تازہ دم ہو جاتا ہوں۔''

خشونت سنگھ جی نے اپنی کلائی کی گھڑی دکھاتے ہوئے کہا...... ''بھئی میں تو اپنی ریسٹ واچ کا بے دام غلام ہوں۔ میں وقت کا بہت پابند ہوں اور سچ پوچھیے تو ہفتہ میں ایک بار میں دلی کے تاج ہیلتھ کلب جاتا ہوں اور وہاں بھارتی خوبرو ناری سے اپنے جسم کی مالش کراتا ہوں اور ہفتہ بھر کے لیے پھر سے چاق و چوبند ہو جاتا ہوں۔ شام کو ٹھیک

سات بجے میں وسکی کا اپنا مخصوص جام اٹھا کر پینا شروع کر دیتا ہوں۔''

''رات ٹھیک 8 بجے میں ڈٹ کر کھانا کھاتا ہوں۔ یہ کھانا عام طور پر میری پیاری بیوی گھر پر بناتی ہے۔ گھر کا پکا ہوا کھانا مجھے اتنا لذیذ لگتا ہے کہ میں ہوٹل کے کھانوں پر بیوی کے تیار کردہ کھانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ وہ بہت لذیذ اور خوش ذائقہ کھانے بناتی ہے۔ کبھی کبھی دوستوں کے بے حد اصرار پر ان کی دی ہوئی پارٹیوں میں بھی شریک ہو جاتا ہوں لیکن یہ میرا معمول ہے کہ رات گیارہ بجے بہر طور بستر پر پہنچ کر محو استراحت ہو جاتا ہوں۔ زندگی بھر کبھی کسی نے مجھے نشے کی حالت میں نہیں دیکھا۔''

''بھارت کے ہندو عوام کو قرآن کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔''

''مجھے مذہبی کتابوں' گرنتھوں اور آسمانی صحیفوں کے مطالعہ کا کبھی شوق نہیں رہا' ہاں ایک بار پرنسٹن یونیورسٹی میں جب وزیٹنگ لیکچرار کے طور پر گیا تھا اور وہاں مذہبیات پر لیکچر دیئے تھے تب ضرور مجھے ان کتب کا بادل نخواستہ مطالعہ کرنا پڑا تھا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ یہ سب انتہائی بور اور اکتا دینے والی کتابیں ہیں لیکن پچھلے دنوں مسلسل ایک ماہ تک قرآن مجید کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی قرآن مجید ایک متاثر کن اور افضل ترین مذہبی کتاب ہے۔'' ان خیالات کا اظہار خشونت سنگھ نے اپنے تازہ ترین ایک کالم میں کیا جو غیر مسلموں کے لیے قرآن کی اہمیت کے عنوان سے (Quran for the Non-Muslims) انڈین ایکسپریس اور سنڈے مڈڈے میں نہایت اہتمام سے شائع ہوا ہے۔

جوان عورتوں کی قربت کا شوقین اور شراب کا رسیا' نہایت زندہ دل دانشور 80 سالہ بھارت کا سکھ صحافی اپنی زندگی میں پہلی بار مسلمانوں کی متبرک کتاب قرآن مجید پر کالم لکھتے ہوئے کہتا ہے...... ''ریڈیو پاکستان سے علی الصبح تلاوت قرآن مجید سن کر میرے دل میں قرآن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ قرآن کے کئی انگریزی ترجمے میں نے دیکھے لیکن سب سے زیادہ علامہ عبداللہ یوسف اور دہلی میں پیدا ہوئے پاکستان کے نامور شاعر اور ادیب احمد علی اور عراق کے جناب این جے داؤد کے ترجمے ''دی قرآن'' نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اب میں حافظ قرآن تو نہیں کہ بتا سکوں کہ قرآن کی کس آیت میں کیا رمز پنہاں ہے

لیکن ایک ادیب اور تبصرہ نگار کے طور پر اس آسمانی کتاب کے بارے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب ایک اہم ترین تخلیق ہے اور اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ زندگی کی اسلامی قدریں کیا ہیں تو آپ یعنی بھارت کے غیر مسلموں کو قرآن پاک کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔''

ممتاز سکھ صحافی اپنے اسی کالم میں آگے چل کر لکھتا ہے۔۔۔'' قرآن کا کوئی نامور مصنف نہیں ہے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اسے خدا کی طرف سے پیغمبر اسلام ﷺ کو کئی برسوں میں وحی کے ذریعہ بتایا گیا تھا۔ اس طرح بالفاظ دیگر قرآن کا رائٹر (مصنف) اللہ تعالیٰ ہے جو کہ اس کا حقیقی مصنف ہے۔'' خشونت سنگھ لکھتا ہے: ''دوسری مذہبی کتابوں کی نسبت قرآن کے الفاظ میں' میں نے دلکشی اور غنائیت سی محسوس کی ہے۔ بعض آیات میں زبردست شاعرانہ تصور ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر زمین کے تمام درختوں کی قلمیں بنالی جائیں اور سات سمندر ملا کر سیاہی تیار کر لی جائے اور اللہ کی تعریف وتوصیف لکھی جائے تب بھی حقیقی لفظوں میں اللہ کی عظمت بیان نہیں کی جاسکتی۔'' قرآن میں ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''ہم جھوٹ پر سچائی انڈیلتے رہیں گے تاوقتیکہ سچائی کی جیت نہیں ہوتی اور جھوٹ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ نہیں ہو جاتا۔''

''دنیا بھر کے مسلمان آج تک قرآن پاک سے مکمل راہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ بھارت کے غیر مسلم میرے اس مختصر سے تجزیے سے از خود اندازہ لگالیں کہ اس کا اصل سبب کیا ہے اور مسلمان کیوں اب تک کامیاب رہے ہیں!''

سردار خشونت سنگھ پاکستان کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کے طیارے پر سوار ہوتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے ایک اسلامی طلسماتی قالین پر پاؤں رکھ دیئے ہوں۔ شلوار قمیض میں ملبوس' سر پر دوپٹہ اوڑھے ایک انتہائی مہذب' حسین اور شائستہ خاتون (ایئر ہوسٹس لڑکی) آپ کو مسکرا کر السلام علیکم کہے گی اور پھر جیسے ہی جہاز کا انجن اسٹارٹ ہوتا ہے روایتی انداز میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی آواز سنائی دیتی ہے اور اس طرح پی آئی اے کی ہر فلائٹ پر مسافروں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ جہاز کے حرکت میں آنے کے بعد کیپٹن کا تعارف کرایا

جاتا ہے۔ پھر سیٹ بیلٹ باندھنے کی درخواست کی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ پرواز کا دورانیہ کتنا ہے میں چونکہ دہلی سے لاہور جارہا تھا اس لیے ہمیں بتایا گیا کہ انشاء اللہ العزیز 40 منٹ کے نہایت آرام دہ سفر کے بعد آپ لاہور پہنچ جائیں گے۔

''پاکستان میں ہر کام کا آغاز لفظ انشاء اللہ (خدا نے چاہا تو) کے دعائیہ لفظ میں کیا جاتا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان پرواز کے دوران پی آئی اے والے شراب پیش نہیں کرتے جبکہ یورپ اور امریکہ کے درمیان سفر کرتے ہوئے وہ ایسا نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر ان لوگوں سے قرآنی فرمان کی تعمیل کرائی گئی تو پھر وہ ان کے جہاز میں سفر کرنا ہی بند کردیں گے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان پروازیں بہت محدود ہوتی ہیں۔ بھارتی بھی اس مختصر سے سفر کے دوران شراب طلب نہیں کرتے اور پاکستانی بھی اپنے ہم وطنوں کی موجودگی میں یہ جرأت نہیں کرتے۔ میں 1947ء سے اب تک ایک بار نہیں کئی مرتبہ پاکستان جاچکا ہوں۔ ہر بار میں نے یہی دیکھا ہے کہ پی آئی اے کی فلائٹ پر سیٹ نہیں ملتی اور انڈین ایئر لائنز کے جہاز آدھے خالی ہوتے ہیں۔ پاکستانی تو اپنے جہاز میں سفر کرتے ہی ہیں بھارتی بھی سفر میں پی آئی اے کو ترجیح دیتے ہیں۔

''پاکستان میں جس طرح گرم جوشی کے ساتھ ایک بھارتی مسافر کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اس کے برعکس اتنی ہی سرد مہری سے بھارت میں ایک پاکستانی کی آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ (پاکستانی کھلے دل کے ساتھ والہانہ انداز میں ملتے ہیں جبکہ بھارت میں اس کے برعکس دیکھنے کو ملتا ہے) داخلہ سے متعلق قواعد وضوابط ہندو پاک میں یکساں اور بہت سنگدلانہ ہیں لیکن متعلقہ لوگوں کا رویہ مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف ہوتا ہے۔ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کے مسافروں سے مجرموں سا سلوک کرتی ہیں۔ وزراء اور سرکاری حکام بارہا ملتے اور ملاقاتیں کرتے ہیں لیکن دونوں ممالک عوام کے لیے ویزا کے اجراء کو تاحال آسان نہیں بنا سکے ہیں۔ ویزا ہر شخص کو آسانی کے ساتھ جاری نہیں کیا جاتا۔ ویزا جاری کیا جاتا ہے تو مسافر سے وضاحت طلب کی جاتی ہے کہ وہ ویزے میں درج شدہ شہروں کے علاوہ کہیں اور جانے کی کوشش نہ کرے اور اسے نہایت سختی کے ساتھ اس امر کی تاکید کی جاتی ہے کہ متعلقہ جگہ پہنچ کر چند گھنٹوں کے اندر اندر اپنی آمد کی رپورٹ متعلقہ تھانے میں کرے اور پھر جب وہاں سے روانہ ہو تو اپنی روانگی کی اطلاع درج کرائے۔

افسوس ہم نے یہ توہین وتحقیر غیر ممالک کے لوگوں کے لیے نہیں اپنے ہی علاقے میں رہنے والے اپنے ہی ہم وطنوں کے لیے مخصوص کر رکھی ہے۔

''ہر بار بھارتی پارلیمنٹ میں یہ مسئلہ اٹھایا جاتا ہے۔ کئی بار میں نے راجیہ سبھا میں یہ مشورہ دیا کہ بھارت کو چاہیے کہ وہ یک طرفہ طور پر پابندیاں اٹھالے پاکستان بھی شرمندہ ہو کر بعد میں یہ پابندیاں ختم کردے گا۔ ہر بار بھارتی وزیر خارجہ نے مجھے یہی جواب دیا کہ یہ مسئلہ زیر غور ہے لیکن بعد میں ہر وزیر داخلہ نے بڑی بے رحمی کے ساتھ میرا یہ مشورہ پائے حقارت سے ٹھکرایا ہے۔ رسائل وکتب کے تبادلہ میں بھی کچھ ایسی پابندیاں عائد ہیں۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک کی کتب اور رسائل منگوا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ فحش لٹریچر اور ملک کی سالمیت کے خلاف نہ ہوں لیکن برصغیر کے ان دونوں ملکوں میں عوام اپنے مطالعے کے لیے اپنی مطلوبہ اور پسندیدہ علمی وادبی کتب آسانی سے نہیں منگوا سکتے۔ جب سے ہندو پاک مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا ہے ہر مرتبہ ایجنڈے میں یہ اہم مسئلہ رکھا گیا مگر اب تک فیصلہ کن کارروائی نہیں ہو سکی ہے۔''

بھارتی صحافی خشونت سنگھ اپنے سفرنامے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''یہ میرے لیے بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ اس بار میرے خصوصی ویزے پر پولیس کو اطلاع دینے سے مستثنیٰ کی حیران کن مہر لگائی گئی تھی۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ پاکستانی کسٹم اور امیگریشن حکام نے نہ تو میرا سوٹ کیس کھلوایا اور نہ پاکستان آنے کے مقصد کے بارے میں سوالات پوچھے۔ پاکستان کا کثیر الاشاعت اخبار ''جنگ'' لاہور میں میری شناخت کا ذریعہ ثابت ہوا۔ جس روز میں لاہور پہنچا اسی روز جنگ لاہور کے صفحہ اول پر میری تصویر کے ساتھ میرے ایک کالم کی خبر رپورٹ کی صورت میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ کالم میں نے بھارتی مسلمانوں کی حب الوطنی اور حمایت میں لکھا تھا۔ ایک کسٹم انسپکٹر نے تو کہہ ہی دیا: ''اچھا آپ ہیں خشونت سنگھ میں ابھی جنگ میں آپ ہی کے کالم پر مبنی رپورٹ پڑھ رہا تھا۔''

میں لاہور میں اپنے ایک قدیم دوست ایم اے رحمٰن کے لڑکے کی شادی میں شرکت کرنے اور اپنا پیدائشی گاؤں دیکھنے گیا تھا۔ میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی تھی اور 1947ء تک وہاں رہا تھا۔ ان گزشتہ چالیس برسوں میں لاہور کی آبادی کئی گنا زیادہ

ہو چکی ہے' کئی نئی رہائشی کالونیاں وجود میں آ چکی ہیں۔ میرے میزبان نے مجھے اپنی کار مہیا کر دی تا کہ میں خود ڈرائیو کر کے اس شہر کو جسے میں اپنا سمجھتا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔

لاہور ایک زمانے میں متحدہ شمالی ہندوستان کا انتہائی پرکشش شہر سمجھا جاتا تھا اور اب یہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ حسین اور پرکشش بن چکا ہے۔ لیکن یہ پرکشش ہے صرف امیروں اور دولت مندوں کے لیے' غریبوں کے لیے نہیں۔ امیر لوگوں کے رہائشی مکانات مال روڈ کے ساتھ ساتھ ہوا کرتے تھے' یہ سڑک زمزمہ سے نہر تک جاتی تھی۔ درمیان میں مشہور و معروف لارنس گارڈن تھا جسے پاکستانی اب باغ جناح کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ سارا علاقہ اب بھی پنجاب کے امراء کی رہائش گاہ ہے۔ 1947ء تک نہر کے ساتھ ساتھ کسی طرح کے مکانات نہیں تھے لیکن اب یہاں بڑی بڑی عالیشان کوٹھیاں اور بنگلے تعمیر ہو چکے ہیں اور اس طرح مکانات کا لامتناہی سلسلہ میلوں تک پھیل چکا ہے۔ ماڈل ٹاؤن کی پرانی بستی (کالونی) ان ماڈرن علاقوں کی آغوش میں آ چکی ہے۔ لاہور کے امراء کی کوٹھیاں اور بنگلے دہلی کے روٴسا کی کوٹھیوں اور بنگلوں سے کہیں زیادہ بڑے اور کشادہ ہیں۔ امراء کی ایک کالونی ''گلبرگ'' کو رشوت پورہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں زیادہ تر کوٹھیاں اور بنگلے ان سرکاری افسروں کے ہیں جنہوں نے عوام سے بھاری رشوتیں لے کر خوب دولت اکٹھی کی اور پھر اس دولت سے یہ ماڈرن کالونی آباد کی ...! ڈیفنس کالونی کا بھی کچھ یہی حال ہے۔

غیر ممالک سے لاہور پہنچنے والے لوگ لاہور کے شہریوں کی خوشحالی دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ایک نہایت خوشحال ملک ہے۔ لاہور میں جگہ جگہ سڑکوں پر لمبی لمبی لیموزین کاریں کھڑی نظر آتی ہیں۔ مرسڈیز' بنیز' ٹیوٹا' کرولا' ڈاٹ سن غرض ہمہ اقسام کی قیمتی کاریں لاہور کی سڑکوں پر دوڑتی نظر آتی ہیں۔ پاکستان میں کاروں کی بہت ہی فراوانی ہے۔ حیرت اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ ان کاروں میں سے کوئی بھی کار پاکستان خود تیار نہیں کرتا ہے۔ عملی طور پر یہاں ہر چیز باہر سے منگوائی جاتی ہے۔ آج سے چھ سال پہلے جب میں پاکستان گیا تو میرے ہوٹل کے ٹائلٹ پیپر اور دیا سلائی تک غیر ملکی تھی۔ پاکستان کی تمام تر خوشحالی سطحی اور عارضی ہے اور اس کی بنیاد ان بڑی بڑی رقوم پر ہے جو پاکستانیوں کو ان کے عرب ممالک' یورپ' کینیڈا اور امریکہ میں کام کرنے والے عزیز اور رشتہ دار یہاں بھیجتے ہیں۔

پاکستان کا ایک تہائی بجٹ امریکی امداد سے پورا کیا جاتا ہے بہرحال اتنا ضرور کہوں گا کہ ایک عام پاکستانی کی حالت ایک کھاتے پیتے بھارتی سے بدرجہا بہتر ہے۔ پاکستان میں آپ کو غربت اور مفلسی کہیں نظر نہیں نظر آئے گی جبکہ بھارت میں بھوک و افلاس کے مناظر جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گھریلو ملازم کہیں دکھائی نہیں دیتے' صرف امراء اور رؤسا کے ہاں بیرے اور خانساماں ہیں۔ جس گھر میں میں رہائش پذیر تھا اس کے خانساماں کی تنخواہ آٹھ سو روپے ماہانہ تھی۔ اس کے ساتھ کھانا' کپڑے اور رہائش مفت تھی۔ شوفر ہزار روپے سے زیادہ تنخواہ پاتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پاکستانی بھکاری بھی ہمارے یہاں کے بھکاریوں سے بہتر کھاتے اور بہتر پہنتے ہیں۔

میں یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین و بے قرار تھا کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق پاکستان کو کس حد تک اسلام کا گہوارہ بنا سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ تقسیم وطن سے ایک سال پہلے پاکستان کے حامی مال روڈ پر نعرے لگاتے پھرتے تھے: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ۔'' جنرل ضیا الحق نے اس نعرے کی وضاحت ''نظام مصطفیٰ ﷺ'' کی اصطلاح کے نام سے پیش کی۔ اس اصطلاح کے بورڈ اور بینر اردو اور انگریزی میں مجھے سڑکوں پر جا بجا لکھے دکھائی دیئے۔ ان کے علاوہ لاہور میں گھومتے ہوئے مجھے بہت سی مسجدیں بھی دکھائی دیں جن کے میناروں پر لاؤڈ سپیکر نصب ہیں۔ جن سے وعظ و نصیحت سننے کو ملتا ہے۔ اذان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بس اس کے علاوہ مجھے احیائے اسلام کہیں دکھائی نہیں دیا۔

پاکستان میں اب برقع پوش خواتین خال خال نظر آتی ہیں۔ ساڑھی کو ایک بھارتی لباس کہہ کر رد کر دیا گیا تھا لیکن اب پھر اس لباس کو اپنا لیا گیا ہے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ چار سال قبل سرکاری دفاتر میں اتنی لڑکیاں کام نہیں کرتی تھیں جتنی آج کل کام کر رہی ہیں۔

پاکستان کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قرآن' حدیث' نعت رسولؐ اور قوالی کے پروگرام کثرت سے اور بہتر انداز میں پیش ہوتے ہیں۔ بعض پروگرام جیسے ''قرآن حکیم اور ہماری زندگی'' بہت مقبول ہیں اور نہایت دلچسپی کے ساتھ سنے جاتے ہیں۔ پاکستان کی نئی نسل اب رسول کریم ﷺ' قرآن مجید اور اسلامی تاریخ کے متعلق ان پرانے لوگوں

کی نسبت بہت زیادہ کچھ جانتی ہے جن کو قرآن پاک کی صرف چند چھوٹی چھوٹی آیات زبانی یاد ہوا کرتی تھیں۔ جو ان کا مطلب و معنی جانے بغیر پنج وقتہ نماز کے دوران انہیں دہراتے رہتے تھے۔ مجھے چاندی کے ان پیالوں کی تلاش تھی جن پر آیت الکرسی (بلاؤں سے محفوظ رکھنے والی آیت) منقش ہوتی ہے۔ دکان کا پچاس سالہ مالک اور اس کے بوڑھے ملازم کوئی بھی ان پر لکھی ہوئی عربی عبارت نہیں پڑھ سکا لیکن میرے ساتھ موجود 23 سالہ عالیہ حسن نے ان منقش آیات کو بڑی آسانی سے پڑھ لیا۔ میں نے اس طرح کے پانچ چھ پیالے خریدے۔ اس نے ان میں سے ہر پیالے پر ایک لیبل چسپاں کر دیا جس پر درج تھا یہ قرآن مجید کے کس پارے کی کون سی آیہ مبارکہ ہے۔

مذہب کے بعد پاکستانیوں کے دل دماغ پر بھارت ایک بھوت بن کر سوار رہتا ہے۔ بھارت سچ مچ ایک ہوا بن کر عام لوگوں پر ہی نہیں سیاست دانوں' اخبارات اور دانشوروں پر چھایا رہتا ہے۔ جن دنوں میں پاکستان میں تھا ان دنوں وہاں کے اردو اور انگریزی اخبارات کے پہلے صفحوں پر جو اہم خبر تھی وہ یہی تھی کہ بھارتی افواج پاکستانی سرحدوں پر کثیر تعداد میں جمع ہو رہی ہیں۔

ہم بھارتیوں کو پاکستان سے شکوہ ہے کہ اس نے جدید ترین امریکی اسلحہ حاصل کر لیا ہے۔ اسلامی بم تیار کر لیا ہے اور خالصتان کے لیے سکھوں کو بھڑکانے میں پاکستان کا ہاتھ ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کے راہنماؤں کے بیانات تھے جن میں پاکستانی عوام کو یقین دلایا گیا تھا کہ پاکستان' بھارت کی ہر دھمکی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے اور اپنی مدافعت کی پوری طاقت رکھتا ہے۔

پاکستانی اخبارات کا اسلوب بیان اتنا تلخ تھا جیسے وہ بھارتی عزائم سے واقعی خائف ہو رہے ہوں۔ میں جس پاکستانی سے ملا اس نے یہی موضوع چھیڑا ایک نوجوان نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ جدوجہد آزادی میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

پاکستانی مجھ سے کہتے: ہم جانتے ہیں کہ بھارت ہم سے تین گنا بڑا ملک ہے لیکن بھارت یہ محسوس کیوں نہیں کرتا کہ روس نے افغانستان پر حملہ کر رکھا ہے۔ 3 لاکھ افغانوں نے پاکستان میں پناہ لے رکھی ہے۔ اس حالت میں پاکستان F-16 طیارے نہ

اواکس جیسے جدید دفاعی طیارے تو محض روس کو پاکستان پر حملہ آور ہونے سے روکنے کے لیے حاصل کر رہا ہے۔ اگر بھارت کو اس بات کا خدشہ ہے کہ پاکستان بم بنا رہا ہے تو وہ شوق سے پاکستانی تنصیبات دیکھ سکتا ہے لیکن اس کے لیے یہ شرط یہ ہے وہ پاکستانی سائنسدانوں کو بھی اپنے ایٹمی پلانٹ دیکھنے کی اجازت دے۔ ان باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ پاکستانیوں کے پاس بھارت کے ہر الزام کا معقول جواب موجود ہے۔

پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کو پاکستان میں ایک خداترس انسان سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنے عوام و خواص میں کافی مقبول ہیں۔ چین سے دوستانہ تعلقات پیدا کرکے اور امریکہ سے بے اندازہ فوجی امداد حاصل کرکے انہوں نے اپنے آپ کو ایک ماہر سیاست داں ثابت کر دکھایا ہے۔ بے نظیر کے جلسوں میں بے شک بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اسے گھومنے پھرنے اور جلسے کرنے کی کھلی اجازت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عام انتخابات میں وہ کچھ سیٹیں جیت بھی جائیں لیکن جنرل ضیا کے مقابلے میں وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکیں گی۔ جنرل ضیا بہت ذہین، سمجھدار اور ہر بات کی تہہ تک پہنچنے والے سربراہ مملکت ہیں۔

خوشونت کہتا ہے کہ جنرل ضیاء کی ہوشیاری، فراست اور دانشمندی کی مثال میں اپنے دوستوں کو درج ذیل کہانی سنا کر دیتا ہوں۔ لیجئے آپ بھی سن لیجئے:

جنرل ضیاء ایک آرائیں خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آرائیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سبزی ترکاری بونے میں ماہر ہوتے ہیں۔

ایک زمیندار نے ایک آرائیں سے کہا کہ بیکار ہو تو میرے ساتھ شراکت کرلو۔ زمین میری ہوگی۔ تم آرائیں ہو اس پر سبزیاں بونا، پیداوار آدھی آدھی ہوگی۔ جو فصل بوؤ گے مٹی کے نیچے والا حصہ تمہارا اور اوپر والا میرا۔

زمیندار سمجھ رہا تھا کہ ارائیں چنا، گندم وغیرہ بوئے گا۔ ارائیں نے کھیتی میں آلو، مولیاں اور گاجریں بوئیں۔ بے چارے زمیندار کو اپنے فیصلے کے مطابق پتے ملے۔

اگلے سال زمیندار نے اپنا فیصلہ بدلتے ہوئے کہا...... بھئی اس سال وہ حصہ لوں گا جو مٹی کے نیچے ہوگا نیچے کا میرا اور اوپر کا تمہارا۔

ارائیں نے زمیندار کا یہ فیصلہ بھی منظور کرلیا۔ زمیندار سمجھ رہا تھا کہ ارائیں گاجر

مولی اور آلو بونے کا ماہر ہے اور وہ اس سال بھی یہ تینوں سبزیاں ہی بوئے گا لیکن چالاک ارائیں نے اس سال گوبھی' ٹماٹر اور کھیرے بوئے فیصلے کے مطابق اس سال بھی زمیندار خالی ہاتھ رہا اور اوپر کی سبزیاں ارائیں کے حصے میں آئیں۔ نیچے کی جڑیں زمیندار کو ملیں۔

تیسرے سال زمیندار اپنے سابقہ سالوں کے نقصانات اور محرومیوں پر چیخ اٹھا اور بولا: میری بات غور سے سنو! امسال تم جو کچھ بھی بوؤ گے اوپر اور نیچے کے حصے میرے ہوں گے درمیانی حصہ تمہارا ہوگا۔

ارائیں نے زمیندار کا یہ فیصلہ بھی مسکرا کر قبول کرلیا۔ بہت بہتر چوہدری صاحب جیسے آپ کی مرضی مجھے آپ کا یہ فیصلہ بھی منظور ہے۔

ذہین ارائیں نے فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے تیسرے سال زمیندار کی کھیتی میں گنا بو دیا۔

فصل کاٹی گئی تو جڑیں اور بالائی کانے گولے زمیندار کے حصے میں آئے اور چالاک ارائیں کے حصے میں رس بھرے گنے آئے۔

سو جناب! میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ بے نظیر کو ایسے ذہین وفطین ارائیں سے کچھ حاصل نہ ہوسکے گا۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

پورے چالیس برس کی جدائی نے ہمارے درمیان بہت بڑا فرق پیدا کردیا ہے۔

ہم ایک دوسرے کے خلاف تین جنگیں لڑ چکے ہیں اور چوتھی جنگ کی دھمکیاں سننے کو مل رہی ہیں۔ میں نے پاکستان میں اپنے ایک ہفتے کے قیام کے دوران یہاں سیاحت پر آئے ہوئے جس بھی بھارتی سے پوچھا اس نے یہی کہا کہ اس کا نہایت گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ یہ بھارتی 47ء میں چھوڑے ہوئے اپنے قدیم گھر دیکھنے گئے تو محلے کے لوگوں نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ انہیں مختلف تحائف سے نوازا اور دل کھول کر مہمان نوازی کی۔

میں اپنے آبائی گاؤں میں ساٹھ سال کے بعد گیا تھا۔ لوگوں نے میرے اعزاز میں آتش بازی کی اور مجھ پر کوٹھیوں پر چڑھے لوگوں نے پھول برسائے۔ ایک ہیرو کی طرح میرا استقبال کیا گیا۔

میرے گاؤں ہڈالی کی اب شکل وصورت تقریباً بدل چکی ہے۔ میں اس کے بعض حصوں کو پہچان بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ یہ چھوٹا سا گاؤں جو کبھی دو سو افراد کے خاندانوں پر مشتمل تھا اس میں زیادہ مسلمان بلوچی تھے۔ ان کی تین ذاتیں تھیں وڈھال' مستیال اور اعوان۔ ان میں سے کچھ اپنے آپ کو ٹوانہ بتلاتے تھے۔ انہیں اپنی فوجی روایات پر فخر تھا۔ یہ لوگ اعلیٰ درجہ کے گھوڑسوار تھے۔ ان کے نام بھی ان کی جسامت کی طرح ہیبت ناک ہوا کرتے تھے۔ مثلاً شہباز خان' طرہ باز خان وغیرہ۔ گاؤں کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر سنگ مرمر کی ایک تختی نصب تھی جس پر لکھا تھا کہ اس گاؤں نے دوسرے کسی بھی گاؤں کے مقابلے میں اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں بڑھ چڑھ کر پہلی عالمی جنگ میں فوجی بھرتی دی ہے۔ گاؤں سے 437 جوان یعنی ہر خاندان کے دو تین جوان بھرتی ہوئے تھے۔ وائس رائے کے باڈی گارڈ فوج کے بلند وقامت اور خوبصورت ترین جوانوں میں سے منتخب کیے جاتے تھے اور ہڈالی کو یہ فخر تھا کہ وائسرائے کے عملہ میں یہاں کے چھ جوان تھے۔

میرا گاؤں ہڈالی ریت کے اونچے اونچے ٹیلوں میں چھپا دکھائی دیتا تھا۔ شمال میں کھیوڑہ کی نمکین چٹانیں تھیں۔ دوسری اطراف میں حد نگاہ تک صحرا ہی صحرا دکھائی دیتا تھا۔ کہیں کہیں کنوؤں کے پاس کھجور کے درخت ہوا کرتے تھے۔ گاؤں کے جوہڑ نمکین پانی سے بھرے رہتے تھے۔ صرف کھجور ہی ہمارا من بھاتا پھل تھا۔ ہم بھینس کے دودھ کے بجائے اونٹنیوں کا دودھ پیتے تھے۔ اونٹوں کے کارواں ہمارے لیے غلہ' سبزیاں' چینی' چائے اور پھل لایا کرتے تھے۔ ہڈالی میں سوائے اپنے جوان ایکسپورٹ کرنے کے کوئی شے برآمد کرنے کے قابل نہیں تھی۔

لیکن میرا گاؤں ہڈالی اب بدل چکا ہے۔ اس کی آبادی تین گنا ہو چکی ہے۔ بہت سے نئے مکان تعمیر ہو چکے ہیں۔ ایک نیا اسکول بھی کھلا ہے۔ فوجی روایات اب بھی بدستور قائم ہیں۔ آج بھی اس گاؤں کے تندرست وتوانا جوان پاکستانی فوج میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ساٹھ برس کے بعد ہڈالی میں میری آمد ایک انتہائی جذباتی تجربہ تھا۔ ان لوگوں نے جس طرح اور جس والہانہ انداز میں میرا خیر مقدم کیا میں ان کا ممنون ہوں اور اتنا ہی

کہہ سکتا ہوں کہ ہڈالی کی زیارت میرے لیے عمرہ یا حج کے مترادف ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

خوشونت جی کے ذاتی تاثرات پڑھنے کے بعد اب آپ وہ انٹرویو بھی ملاحظہ کریں جو پاکستان سے واپس دہلی پہنچ کر "سنڈے میل" کے نمائندہ خصوصی نے ان سے لیا تھا:

سوال: آپ کے حالیہ دورۂ پاکستان کا مقصد کیا تھا ؟

خشونت سنگھ: میں لاہور میں شادی کی ایک تقریب شرکت کے لیے بلایا گیا تھا۔ اسی سفر کے دوران مجھے سرگودھا کے قریب قصبہ ہڈالی میں اپنا گاؤں دیکھنے کا موقع بھی مل گیا۔

سوال: آپ اپنے دورے کے تاثرات مختصر الفاظ میں کس طرح بیان کرنا پسند کریں گے؟

جواب: پاکستان میں کسی بھی سکھ کا زبردست اور پرجوش خیر مقدم ہوتا ہے۔ جس روز میں لاہور پہنچا اس روز پاکستان کے سربرآوردہ اخبار جنگ لاہور میں میرے کالم پر مبنی رپورٹ چھپی تھی۔ اسی رپورٹ کے ساتھ میری تصاویر بھی تھیں۔ اس طرح پاکستان میں جنگ حقیقی معنوں میں میری شناخت کا ذریعہ بنا۔ لوگ مجھ سے مل کر اور مجھ سے باتیں کر کے بہت خوش ہوئے۔ میرا وی آئی پی انداز میں خیر مقدم کیا گیا۔

سوال: آپ کا کہنا ہے کہ آپ نے چند سال پہلے بھی پاکستان کا دورہ کیا تھا' اس وقت کے مقابلے میں اب پاکستان کے حالات کیسے ہیں؟

جواب: جی ہاں میں اس روز وہاں تھا جس دن بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی اور غالباً اسلام آباد میں' میں واحد بھارتی صحافی تھا' اس روز نہ تو بڑے پیمانے پر کوئی مظاہرہ ہوا اور نہ تشدد کے واقعات ہوئے تھے۔ عوام بھٹو کی موت پر کسی طرح بھی اپنے ردعمل کا اظہار نہ کرسکے' دوسرے روز میں کراچی میں جائزہ لینے کے لیے گیا تھا۔ مجھے وہاں ہنگاموں کی توقع تھی لیکن وہاں بھی کچھ نہ ہوا لیکن بعد میں چند سال کے بعد جانے کس طرح بھٹو کو غریبوں کے حامی اور قومی ہیرو کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

جہاں تک صدر ضیا الحق کا تعلق ہے لوگ ان کی عزت کرتے ہیں' اگر محبت نہیں کرتے تو ان سے نفرت بھی نہیں کرتے۔ پورے ملک میں انہیں ایماندار اور دیندار تسلیم کیا

جاتا ہے۔ ان کی زندگی اعتراضات سے بالاتر ہے۔ وہ اور ان کے خاندان کا کوئی بھی فرد کسی بھی اسکینڈل میں ملوث نہیں ہے۔ اس لیے سچی بات تو یہ ہے مجھے تو ان کی قیادت کے لیے فی الحال کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

سوال: بے نظیر اور صدر ضیا کے ایک دوسرے کے متعلق رویہ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟ کیا بے نظیر صدر ضیا کے لیے کبھی خطرہ ثابت ہو سکتی ہیں؟

جواب: ایسا معلوم ہوتا ہے صدر ضیا کو پاکستان کے عوام کی جو حمایت حاصل ہے وہ بے نظیر کو حاصل نہیں ہے۔ لوگ بے نظیر کی تقریریں سننے کے لیے بڑی تعداد میں اکٹھے ضرور ہوتے ہیں، وہ حکومت پر تنقید کرتی ہیں تو خوش بھی ہوتے ہیں لیکن ان کا یہ جذبہ اتنا قوی نہیں کہ جنرل ضیاء کی مستحکم حکومت کو تبدیل کر سکے۔

سوال: سکھوں کے مسئلہ پر پاکستانی اپنے آپ کو کس حد تک ملوث سمجھتے ہیں؟

جواب: پاکستانی قطعی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا دہشت پسندوں کے ساتھ کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں۔ میرے خیال میں وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں خود بھارتی حکومت بھی اب تک کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہی ہے۔

سوال: کیا پاکستان واقعی ایک اسلامی ملک ہے؟

جواب: نئی تعمیر شدہ عالیشان مساجد دیکھ کر تو ایسا ہی نظر آتا ہے کہ پاکستان واقعی ایک اسلامی ملک ہے۔ شراب پر پابندی ہے لیکن مہنگے داموں پر ہر قسم کی شراب دستیاب ہو جاتی ہے۔ نشیات عام ملتی ہیں۔ رشوت ستانی کا ہر جگہ دور دورہ ہے۔

سوال: اپنے آبائی گاؤں ہڈالی پہنچ کر آپ کو کیسا محسوس ہوا... ؟

جواب: پاکستان میں اپنے گاؤں ہڈالی پہنچ کر میں اس طرح پھوٹ کر رویا جیسے کوئی گم شدہ بچہ ایک عرصے کے بعد اپنی ماں سے مل جانے پر رونے لگتا ہے۔

بھارتی صحافی خشونت سنگھ نے کہا کہ بھارت میں آج حب الوطنی کا سب سے بڑا ثبوت پاکستان دشمنی کا رویہ اپنانا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان ابھی تک اعتماد کی فضا قائم نہیں ہو سکی ہے۔ یہ انتہائی ناپسندیدہ صورت حال ہے۔ ہمارے ملک کے سیاست دانوں کو اپنا طرز فکر بدل کر غیر ذمہ دارانہ بیانات سے اجتناب کرنا چاہیے۔

(ترجمہ و تلخیص: مقبول احمد دہلوی)

پہلا حصہ

بھارت اور بھارتی

1984ء کا نوحہ

آزادی کے بعد یہ سال ہندوستان کی تاریخ کا بدترین سال ہے اور سکھوں نے 133 سال پہلے اپنی بادشاہت کھو دینے کے بعد سے آج تک ایسے بدترین سال کا سامنا نہیں کیا ہے۔ ہندوستان اور سکھ دونوں کے مقدر ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرے پیوستہ ہیں۔ اگر ایک ڈوبتا ہے تو دوسرا بچ جائے گا اس کی امید کم ہی نظر آتی ہے۔ آپ شاید سوچتے ہوں کہ سکھ جو آبادی کا دو فیصد بھی نہیں ہیں ایک معمولی سی اقلیت ہیں اور ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا ہے اس سے ستر کروڑ کی آبادی پر مشتمل ایک ملک کی تقدیر پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ میری تمنا ہے کہ ایسا ہوتا مگر میں اسے ذرا اور طرح سے دیکھتا ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں ذاتی تجربے کی بنا پر اس بات کی توضیح پیش کرسکوں۔

میں نے کچھ وقت شہر میں دلی واقع سکھ پناہ گزینوں کے کیمپوں میں جا کر گزارا ہوا ہے۔ نومبر کے اوائل میں یہاں رہنے والوں کی تعداد پچاس ہزار سے کچھ زیادہ تھی جن میں زیادہ تر لابانہ ذات کے غیر ہنرمند لوگ تھے انتظامیہ نے ان کو حکم دیا کہ دو ہفتوں کے اندر اندر وہ واپس اپنے گھروں یا جو کچھ وہاں باقی رہ گیا تھا وہاں چلے جائیں۔ زیادہ تر لوگوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان علاقوں میں ابھی تک قاتل دندناتے پھر رہے تھے۔ یہ لوگ یا تو چند سکھ گردواروں کی طرف سے مہیا کردہ عارضی گھروں میں منتقل ہو گئے یا پھر پنجاب کی طرف ہجرت کر گئے۔ جہاں ان کا نہ تو کوئی گھر تھا

نہ زمینیں اور نہ جان پہچان صرف دور پار کے چند رشتہ دار موجود تھے (ہر سو افراد میں سے ننانوے پاکستان سے ہجرت کر کے آئے تھے) یہی سب کچھ بہار' اتر پردیش (زیادہ تر کان پور) سے آنے والے سکھوں کے ساتھ بھی ہوا۔ ان علاقوں میں لوٹ مار' قتل و غارت اور املاک کو نذر آتش کر دینے کے واقعات دلی میں رونما ہونے والے واقعات کی طرح ہی وحشیانہ تھے۔ راجیو گاندھی اور بہار اور یوپی کے وزرائے اعلیٰ کی جانب سے کرائی جانے والی یقین دہانیوں پر اعتماد نہ کرنے کی صاف سی وجہ یہ تھی کہ سکھوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ لوگ سکھوں کے قتل عام کے لیے ہونے والے ہنگاموں کو روکنا چاہتے اور بروقت اقدامات کرتے تو یہ سب کچھ شروع ہی نہ ہوتا۔

وہ جو اس نظریہ کے حامی ہیں کہ سکھ سبق سکھلائے جانے کے حقدار ہیں انہیں تسلی رکھنی چاہیے کیونکہ درحقیقت سکھوں نے کسی نہ کسی قسم کا سبق تو ضرور سیکھ لیا ہے۔ مگر یہ وہ سبق نہیں ہے جو سکھوں پر جال پھینکنے والوں نے سوچ رکھا تھا۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ چند پناہ گزین کیمپوں کا دورہ کریں اور وہاں موجود تو سو یا اس سے زائد بیواؤں میں سے کسی سے بھی پوچھیں کہ وہ کیا محسوس کرتی ہیں جنہوں نے نا صرف روٹی کما کر لانے والے اپنے شوہر بلکہ اپنے بیٹوں کو بھی کھو دیا ہے۔ انہیں ان آدمیوں سے جا کر بات کرنی چاہیے جن کی ٹانگیں پلستر میں قید ہیں اور جن کے سر اور داڑھی کے لمبے بال نوچ لیے گئے ہیں اور ان لاتعداد لڑکیوں سے جا کر پوچھیں' جن کی عزت و ناموس کے تقدس کو پامال کیا گیا ہے' کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے آیا ان کے ساتھ وہ سب کچھ ہونا چاہیے تھا۔ اس حقیقت سے بھی وہ اطمینان حاصل کر سکتے ہیں کہ دلی کی سڑکوں پر نظر آنے والے سکھوں کی تعداد میں نمایاں کمی ہو گئی ہے اور یہ کہ وہ لوگ جو کبھی جوشیلے اور ملنسار ہوا کرتے تھے ان کے چہرے غمزدہ اور نگاہیں جھکی ہوئی نظر آتی ہیں; گوردواروں میں لگے لاؤڈ اسپیکروں سے بلند ہونے والی آوازیں جو اردگرد کے مکینوں پر گراں گزرتی تھیں' خاموش ہو چکی ہیں; سیس گنج اور بنگلہ صاحب جیسے گوردواروں میں جہاں ہر وقت کھوے سے کھوا چھلا کرتا تھا' حاضرین کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ گروبانی کا کیرتن ہمیشہ کی طرح اب بھی کانوں میں رس گھولتا ہے لیکن اب اس کی گونج آدھے خالی ہالوں میں سنائی دیتی ہے۔

میں نے خود سے پوچھا'' کیا سکھوں نے تاریخ میں اپنا کردار مکمل کر دیا ہے؟ اور کیا اب وہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرح حمد یہ کلام پڑھنے والا ایک طبقہ بن کر رہ جائیں گے؟''
قوموں کے عروج وزوال کی بابت علامہ اقبال نے درج ذیل الفاظ کہے تھے:

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے؟
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

پنجاب جس پر پہلے ہی سے طبقات زدہ ہونے کا الزام ہے اس کی کیا صورتحال ہوگی جب نفرت کی یہ آگ مختلف شہروں اور قصبوں میں بھڑک اٹھے گی؟ اگر اس کا بروقت تدارک نہ کیا گیا تو یہ اتنی ہی مہلک ثابت ہوسکتی ہے جتنی کہ ایم آئی سی گیس جس نے بھوپال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کیا ہم اپنے ملک کی سب سے اہم سرحد اور جموں وکشمیر کے ساتھ واحد زمینی رابطے کو ہمیشہ کے لیے غیر مستحکم بنائے رکھنے کے روادار ہوسکتے ہیں؟ سال کے اختتام پر سب ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ اس مسئلے پر غور کریں۔ میں بذات خود نئے سال 1985ء کے لیے چند نئے سال کے عہد تجویز کرنا چاہتا ہوں اور سکھوں کے لیے وہ یہ ہیں کہ اپنے ہندوستانی ہونے کی غیر مشروط تجدید کرو' خالصتان کی مذمت کرو اور اپنے اندر موجود خالصتانیوں کو خود سے علیحدہ کر دو اور وہ لوگ جو بندوقوں' بموں اور پستولوں کی زبان استعمال کرتے ہیں ان کی مذمت کرو۔ اپنے پنجابی ہندوستانی بھائیوں کو یقین دلاؤ کہ جب تک تم زندہ ہو کوئی بھی شر پسند انسان ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا ہے۔ باقی تمام ہندوستانیوں کے لیے یہ عہد کچھ یوں ہیں کہ تمام سکھوں کو خالصتانی سکھ مت سمجھو بلکہ عزیز ہندوستانیو! سکھوں کو ان کا وہ باعزت مقام واپس لوٹاؤ جو 1984ء کے زوال سے پہلے ان کا تھا۔ اگر تم اپنے ملک کو منتشر ہونے سے بچانا چاہتے ہو تو تمہارے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں اگر سکھ ڈوبیں گے تو ہندوستان بھی ان کے ساتھ ڈوبے گا۔

❖ ○ ❖

پنجاب کا مسئلہ

آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن پر بحیثیت وزیر اعظم قوم سے خطاب کرتے ہوئے راجیو گاندھی نے نہایت شاندار تاثر قائم کیا۔ یہ کوئی عظیم عوامی خطاب نہیں تھا مگر یہ تقریر مفصل، مربوط اور خلوص کی فضا میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ بات تو واضح ہے کہ فن تقریر میں وہ بہ نسبت اپنی والدہ یا نانا پنڈت جواہر لعل نہرو کے زیادہ نوازا گیا ہے۔ اس کی مردانہ وجاہت اور انداز گفتگو اسے اپنے والد فیروز گاندھی سے ورثے میں ملی ہے؛ جس نے لوک سبھا میں بحیثیت شعلہ بیاں مقرر اپنی پہچان قائم کیے رکھی۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ ہی عرصہ میں وہ سب کو اپنی تقریر سے سحر زدہ کر دیا کرے گا۔ تاہم، جنگلی گھوڑوں کو اپنی بگھی میں لگانے کے بعد انہیں بھگائے پھرنے کے لیے ساحرانہ تقریروں سے کچھ زیادہ کی ضرورت پڑے گی۔

اس وقت اس کی پارٹی کے افراد میں سے کوئی بھی فرد جسے وزارت سے باہر رکھا گیا ہے اس کی ناراضگی کی بظاہر سادہ سی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس الزام دینے کے لیے کوئی نہیں ہے۔ مگر خطرات جلد ہی آ جاتے ہیں جیسے وہ آنے کے پابند ہوتے ہوں۔ پھر اسے اپنی تمام عیاری اور اپنے زور بازو کو یکجا کرنے کی ضرورت ہوگی تاکہ باگیں اس کی گرفت میں رہ سکیں۔

راجیو کی اولین ترجیح آسام اور پنجاب ہیں۔ میں آسام والوں کی مشکلات کی

نسبت پنجاب کے مسئلے سے زیادہ اچھی طرح واقف ہوں۔ اس لیے میں اپنے مشاہدات کو اسی کے ممکنہ حل کے لیے محدود رکھوں گا۔ اب مسائل چندی گڑھ اور پانی کی تقسیم تک نہیں رہے۔ بھنڈراں والا کا عروج وزوال' آپریشن بلیو سٹار پنجاب کے دیہی علاقوں میں فوج کی نقل وحرکت' خصوصی عدالتیں' مسز گاندھی کا قتل' جنوبی ہندوستان کے شہروں میں سکھوں کا قتل عام اور ایک بہت بڑی تعداد کی پنجاب کی طرف ہجرت جیسے مسائل بھی اب اس میں شامل ہیں۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ ہم ابھی تک مکمل حقائق سے آگاہ نہیں ہیں۔ جن واقعات کی بناپر آپریشن بلیو سٹار ہوا ان کو چھپانے کی حکومتی کوششوں اور اس واقعہ کے بعد جاری ہونے والے وائٹ پیپر سے پیدا ہونے والی صورتحال کو وزیراعظم نے بذات خود رد کردیا ہے۔ باہمی اتفاق کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت نومبر 1984ء کے پہلے ہفتے میں معصوم سکھوں کے منظم قتل عام سے نظریں چرانے کے غیر اخلاقی فعل پر نادم ہو اور اپنی پارٹی کے ان لوگوں کی بے گناہی ثابت کرے جن کے نام قصوروار افراد کی فہرست میں شائع ہو چکے ہیں۔ مجرموں کی شناخت کرنے کے بعد انہیں دی جانے والی سزا کے لیے حکومت کو عدالتی کارروائی کے نفاذ میں برتی جانے والی بے حسی پر قابو پانا چاہیے۔ جب تک ان رکاوٹوں کو دور نہیں کیا جاتا پنجاب میں مستقل امن وامان قائم نہیں ہوسکتا۔

نئی پارلیمنٹ کا افتتاحی اجلاس

میری خواہش ہے کہ پارلیمنٹ کا نیا اجلاس ٹی وی پر دکھایا جاتا۔ یہ ایک رنگا رنگ تقریب ہے جہاں دونوں ایوانوں کے سات سو سے زائد مرد و زن اراکین اپنے بہترین لباس اور مزاج کے ساتھ موجود ہیں۔ وجہ بالکل سادہ سی ہے کہ جو حاضر ہیں وہ کچھ سنانے سے زیادہ دکھانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ سنٹرل ہال کا ڈائس تیغہ سونے خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ جناب صدر کی حفاظت پر معمور چھ طویل قامت نیلے اور سنہری لباس میں ملبوس فوجی جوان صدارتی کرسی کے دونوں جانب اپنے نیزوں کو بلند کیے کھڑے ہیں۔ گیارہ بجتے ہی بگل کی آواز بلند ہوتی ہے اور سب کھڑے ہو جاتے ہیں کبوتر چونک کر ہال میں اڑنے لگتے ہیں۔ چھ فٹے باڈی گارڈز کی سربراہی میں دونوں ایوانوں کے سیکرٹری' صدر صاحب' نائب صدر' وزیر اعظم اور دوسرے افسران تشریف لاتے ہیں۔ ماسوائے وزیر اعظم کے باقی سب باڈی گارڈز کے مقابلے میں پست قامت دکھائی دیتے ہیں اور سب قدم سے قدم ملا کر چل نہ پانے کی وجہ سے محتاط نظر آتے ہیں۔ آمد کے فوراً بعد وہ سب اپنی نشستیں سنبھال لیتے ہیں اور فوجی بینڈ قومی ترانہ بجاتا ہے ایک بار پھر سب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صدر صاحب گلا صاف کر کے پانی کی ایک چسکی لیتے ہیں اور خطاب پڑھنے لگتے ہیں جو کہ حکومت کی طرف سے ان کے لیے ہندی میں تیار کیا گیا ہے۔ متن پڑھنے کے لیے انہیں چالیس منٹ اور دو گھونٹ پانی خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ اس تقریر کا انگریزی

ترجمہ پڑھنے کے لیے نائب صدر وینکٹ رامن 19 منٹ سے بھی کم وقت صرف کرتے ہیں۔ یہ سارا عمل ایک گھنٹے میں مکمل ہو جاتا ہے اور ایک بار پھر قومی ترانہ بجایا جاتا ہے اور پھر جناب صدر' نائب صدر' وزیر اعظم اور سیکرٹریوں کا دستہ اپنے قومی الجثہ باڈی گارڈوں کی ہمراہی میں بمشکل قدم ملاتا ہوا واپس چلا جاتا ہے۔

دونوں ایوانوں میں پہلا دن بہت رنجیدہ تھا اور اسے مرحومہ اندرا گاندھی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ اس دن اراکین کے لیے کچھ ایسا کہہ دینے کا موقع تھا کہ جسے آنے والے وقتوں میں مثال بنا کر پیش کیا جاتا۔ مگر افسوس! دونوں ایوانوں سے ہونے والی تقاریر میں سے ایک بھی تقریر ان توقعات پر پورا نہیں اتری کیونکہ کسی نے بھی کچھ انمول الفاظ تیار کر کے لانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اگر یہاں جواہر لعل نہرو یا رادھا کرشن ہوتے تو اس موقعہ پر کہنے کے لیے موتی جڑے محاورات کی نوک پلک سنوارنے میں کئی گھنٹے صرف ہو سکتے تھے۔ ایک طرف آج ہم مقدس اعتماد کی روایتی بے وفائی کی وجہ سے تاریخ کے ابواب میں موجود ایک نہایت شاندار خاتون سے محروم ہو گئے ہیں۔ ایک ایسی خاتون سے جس کے ہاتھوں میں ساڑھے ستر کروڑ افراد پر مشتمل قوم نے چودہ سال سے زیادہ تک کے عرصہ کے لیے اپنی منازل کی باگ دوڑ تھمائے رکھی تھی اور دوسری طرف یہ سب دوسرے درجے کے لوگ گھسے پٹے جملوں کے ذریعے شیخی بگھارنے میں مصروف ہیں کہ کس طرح وہ سب ان کے کس قدر قریب تھے۔ اندرا گاندھی اور ان کے ساتھ کسی کا موازنہ کرنا نہایت ناگوار عمل ہو سکتا ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں پڑی کہ ان کے سامنے قیصر روم' روسی زار' فرانسیسی بونا پارٹ اور انگلستان کے شاہ تھے جبکہ ہمارے زمانے کے صدور اور وزرائے اعظم کا قد ان کے سامنے چھوٹا تھا۔ (وہ صرف اسی دور سے تعلق نہیں رکھتی تھیں بلکہ حیات جاودانی رکھتی ہے) اور یہ کہ ہم ان جیسی کسی شخصیت کو دوبارہ دیکھ نہیں پائیں گے۔ انہیں ہمیشہ سراہا جائے گا اور ہمیشہ ان کی یاد میں آنسو بہائے جائیں گے۔

مسز گاندھی کا نہ تو کوئی مخصوص سیاسی فلسفہ تھا اور نہ ہی انہوں نے کوئی روایتی اسلوب اپنا رکھا تھا۔ وہ بیک وقت تند و تیز لہجے میں گفتگو اور منکسر المزاجی کا مظاہرہ کر سکتی

تھیں۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ وہ ملک کو متحد رکھنے کی خاطر کسی مثالی تصور کے ساتھ منسلک تھیں۔ انہوں نے خود کو اس پر قائل کر لیا تھا کہ اس مثالی تصور کو وہ خود یا ان کا کوئی بیٹا ہی حقیقت کا روپ دے سکتا تھا۔ یہ ترغیب اور یقین ایمان میں تبدیل ہوتے ہوئے جذباتی وجدان کی صورت اختیار کر چکے تھے۔

ہم میں سے زیادہ پڑھے لکھے طبقہ کے شاہی سلسلوں کے متعلق خدشات سے قطع نظر جب سے قوم نے مسز گاندھی کے بیٹے کو ان کا جانشین منتخب کیا ہے' ہمیں اسے عوام کی مرضی سمجھ کر قبول کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ بات بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ اس کی شروعات نہایت ہونہار جانشین جیسی ہیں۔ اگر وہ صحیح راستہ پر چلتا ہے تو یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی حمایت کریں۔ اس موقعہ پر ہماری دعا ہونی چاہیے:

''آج وہ امید کے نازک پھول بکھیرتا ہے۔

خدا کرے کہ آنے والے وقت میں وہ عزت واحترام کے رسیلے

ثمرات سمیٹے۔''

سیاسی سکرین کے فلمی ستارے

فلمسٹار کامیاب امیدوار تو بن جاتے ہیں مگر شاذ و نادر ہی اچھے پارلیمنٹرین ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں سے چھ کے ساتھ میری ملاقات راجیہ سبھا میں میرے پانچ سالہ دور کے دوران ہو چکی ہے۔ یعنی نرگس دت' سیوا جی گنیسن' امیتابھ' سنیل دت' وجنتی مالا اور جے للیتا۔ نرگس بے چاری اپنی قدر و منزلت ثابت کرنے کے لیے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکی۔ سیوا جی گنیسن جب حلف اٹھانے کے لیے آئے تو نہایت ڈرامائی انداز میں نمودار ہوئے۔ اس کے بعد وہ ایوان میں کبھی کبھار ہی دکھائی دیئے۔ امیتابھ' سنیل اور وجنتی مالا ابھی نئے تھے اور انہیں ابھی تک کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پھر ایک تو یہ کہ وہ حکومتی پارٹی کے اراکین میں سے تھے اور لوک سبھا میں حکومتی اراکین کی تعداد اتنی وافر ہے کہ انہیں کچھ کہنے کے زیادہ مواقع فراہم کیے بھی نہیں جا سکتے ہیں۔ ان حالات میں اگر وہ اپوزیشن میں ہوں تو زیادہ بہتر خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔ دوسری وجہ اپنی ترجیحات کا فیصلہ نہ کر پانا لگتی ہے۔ ان کی شوٹنگ کے اوقات کار پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں مداخلت کرتے ہیں اور ویسے بھی ایوان میں حاضری کے ملنے والے 75 روپے فی گھنٹہ کی نسبت شوٹنگ سے حاصل ہونے والے منافع کی رقم واضح طور پر زیادہ ہے۔ صرف ایک جے للیتا ہیں جن کے بارے میں لگتا ہے کہ انہوں نے بالآخر فلمی ستارہ بننے کی بجائے سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ اس وقت ان کی پانچوں

انگلیاں گھی میں ہیں۔ ایم۔ جی راما چندرن کے گہنا جانے کی مدد سے وہ تامل ناڈو کی سب سے زیادہ ووٹ اکٹھا کرنے والی شخصیت بن چکی ہیں۔ دونوں دھڑوں میں ان کے پاؤں موجود ہیں۔ AIADMK کا رکن ہونے کی وجہ سے وہ برسراقتدار کانگریس کے لیے قابل قبول ہونے سے زیادہ کے معنی رکھتی ہیں اور تھوڑا سا اپوزیشن کا حصہ ہونے کی بنا پر انہیں بولنے کے زیادہ مواقع اور وقت بھی مل جاتا ہے۔ اپنی اس پوزیشن کا وہ بھرپور ناجائز فائدہ بھی اٹھاتی ہیں۔ موصوفہ حسن وعقل اور صلاحیت و استقلال اور بلند نگاہی کا نایاب پیکر ہیں۔ میں نے بجٹ کے موقعہ پر دو مرتبہ ان کی تقریر کو سنا۔ آخری مرتبہ انہوں نے پروفیسر نرمل چیٹر جی اور سابق وزیر خزانہ پرناب مکر جی کے بعد بات کی۔ اول الذکر دو افراد کی طرف سے خوفناک تخمینی مسائل پر روشنی ڈالنے کے بعد مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ کہیں معیاری تقریر میں تیسرا نمبر بے چاری للیتا کا نہ ہو۔ مگر وہ خود اعتمادی کی تصویر دکھائی دیتی تھی۔ اس کے خوبصورت نین نقش اسے مکمل توجہ کے حصول کا یقین دلاتے تھے۔ اس کی شیریں آواز اور اس کی تقریر کے حقیقی مواد نے آدھ گھنٹے سے زیادہ وقت تک اسے قابل احترام بنائے رکھا۔ وہ صابن پر سے ایکسائز کے خاتمے اور رامیش ورم کے مچھیروں کو دی جانے والی ریلیف جیسے موضوعات پر سے مسکراتی ہوئی گزرتی چلی گئی تھی۔

اس حسین دوشیزہ نے ہندوستان کے سیاسی منظر نامے کے عین وسط میں اپنی جگہ بنالی ہے اور ہندی بولنے والی تامل ہونے کی حیثیت سے آنے والے کئی سالوں میں اپنے مرکزی کردار کو یقینی بنالیا ہے۔

ہندوستان کی سیاسی دوراندیشی

ہمارے تاریخ دانوں نے مختلف نسلی طبقوں کو رسما یکجا کر کے ایک ناقابل معافی فعل سرانجام دیا ہے چونکہ مسلمانوں نے کئی صدیوں تک ملک پر حکمرانی کی ہے اس لیے تاریخ دانوں نے اپنا مطلب نکالنے کے لیے ان کی مسخ شدہ تصویر کشی کی ہے۔ غیر مسلموں کی سوچ میں یہ بات راسخ کی گئی تھی کہ زیادہ تر مسلمان حکمران متعصب اور تہذیب سوز تھے جنہوں نے بت پاش پاش کیے' مندر تباہ کیے اور کافروں کے ساتھ ساتھ گایوں کو بھی ذبح کیا۔ جس طرح کچھ لوگ قانون سے مستثنیٰ ہونے کے طور پر نمایاں کیے جاتے ہیں یہ جاننے کے لیے کہ اس کو تحریر کرنے والا کون ہو سکتا ہے ذرا اس وصیت کو پڑھیے جو ایک مسلمان بادشاہ نے اپنے بیٹے اور ولی عہد کے نام تحریر کی تھی:

> ''اے ولی عہد سلطنت! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے آراستہ ہے۔ الحمدللہ! کہ اس نے تمہیں اس کی حاکمیت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اب تم پر یہ لازم ہے کہ اپنے دل کی تختی سے تمام مذہبی تعصبات صاف کر ڈالو اور انصاف کے تقاضے ہر مذہب کے مطابق پورے کرو۔ خاص طور پر گائے کی قربانی سے احتیاط برتو۔ گائے ذبح کرنے سے تم ہندوستانی عوام کے دل نہیں جیت سکتے مگر اس ملک کے عوام شاید اسے شاہی فرض سمجھ کر اس کی بجا آوری کرتے رہیں۔ کسی بھی طبقے کے ایسے مندر یا مزارات کو تباہ مت کرو جو

حکومت کے احکامات کی پاسداری کرتے ہیں۔ انصاف کے تقاضوں کو اس طرح پورا کرو کہ بادشاہ رعایا سے اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔ فروغ اسلام جابرانہ حکومت کی تلوار کے بجائے احساس فرض کی تلوار سے زیادہ بہتر طریقے سے سرانجام پا سکتا ہے۔"

یہ تحریر بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو لکھی تھی۔

معاہدے کی سیاست: چولی کے پیچھے کیا ہے؟

جس طریقہ کار کے تحت پنجاب کا معاہدہ طے ہوا خوش قسمتی سے مجھے بھی اس سے تھوڑا بہت سیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ان محتاط طریقوں پر نئی روشنی ڈالتا ہے جو کہ اختلافی نکات کے حل ہو جانے تک بحث مباحثوں کو صیغہ راز میں رکھنے کے لیے اختیار کیے گئے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ کام کرنے کی اس عظیم صلاحیت پر بھی روشنی ڈالتا ہے جو کبھی کسی ہوائی کمپنی میں حیلے بہانے کرنے والے پائلٹ نے اپنے سیاستدان اور وزیراعظم بن جانے کے بعد حاصل کر لی تھی۔

اکالی رہنماؤں کو جیل سے رہا کر دینے کے فوراً بعد ہی مذاکرات پھر سے شروع ہو گئے تھے۔تقریباً گیارہ ماہ کی قید کاٹنے اور اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنے والے چند افراد کی تلخ نوائی سمجھ میں آتی تھی لیکن چند ایک نے سوچا کہ انہیں اپنے غصہ کو قابو میں رکھنا چاہیے اور نئے وزیراعظم کو جس نے پنجاب کو اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھا ہے اس مسئلہ کے حل کے لیے ایک موقع دینا چاہیے۔پہل کرنے والوں میں ٹوہرا اور بادل شامل تھے۔لونگووال' بلونت سنگھ اور برنالا بھی ان کے ساتھ جا ملتے ہیں۔گورنر ارجن سنگھ جس نے ان مذاکرات میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا اس کا لونگووال' بلونت اور برنالا گروپ کو وزیراعظم اور ان کے مشیروں سے ملوانے کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ایک سرکاری جہاز انہیں بار ہا چندی گڑھ سے دلی لاتا رہا تھا۔یہ سب کچھ بغیر معمول تبدیل کیے رات کے

اندھیرے میں وقوع پذیر ہوا۔ جب پریس کے شکاری رپورٹر کسی کھوج میں ہونے کی بجائے پریس کلب میں مے نوشی یا گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تاہم پھر بھی خبریں منظر عام پر آجاتی تھیں اور وہ لوگ جن سے مصیبت کھڑی کر دینے کی توقع تھی حقیقتاً مصیبت پیدا کرنے والے ثابت ہوئے۔ اکالی مذاکرات کاروں نے تجویز پیش کی کہ وزیراعظم اپنی کابینہ کی ذیلی کمیٹی کے بغیر صرف گورنر ارجن سنگھ کی موجودگی میں ان سے ملاقات کریں۔ یہ نازک عمل کچھ اس طرح سے سرانجام دیا گیا کہ میں اس کا راز افشا نہیں کر سکتا ہوں۔ آخری ملاقات درمیانی رات سے صبح پانچ بجے تک جاری رہی۔ اس ملاقات میں بھجن لال کو بلایا گیا تھا۔ جب چندی گڑھ کے پنجاب کے ساتھ الحاق اور مستقبل میں فاضلکا اور ابوہر سے اس کو علیحدہ کرنے کی تجویز کے بارے میں بتایا گیا تو ہریانہ کے وزیراعلیٰ جذبات فروشی پر اتر آئے۔ انہوں نے اپنی قمیض پھاڑ کر چھاتی نمایاں کرتے ہوئے کہا: ''اگر یہ بات ہے تو مجھے گولی ماردی جائے۔'' راجیو نے اپنے ایک اہلکار سے بھجن لال کو دوسرے کمرے میں لے جا کر ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔ دو گھنٹے بعد انہیں دوبارہ واپس بلا لیا گیا۔ اس وقت تک ان کی مہلک طبیعت سنبھل چکی تھی۔ وہ فوری طور پر معاہدے کے لیے رضامند ہو گئے۔ ان دو گھنٹوں میں ان کے ساتھ کیا ہوا اس کے متعلق صرف قیاس آرائی ہی کر سکتا ہوں۔

باقی ماندہ دن وزیراعظم نے چھوٹے موٹے نکات سلجھانے میں گزارا۔ بعد میں شام کے وقت میری ان سے پارلیمنٹ میں ملاقات ہوئی۔ وہ پچھلے 24 گھنٹوں کے دوران چند منٹوں سے زیادہ سو نہیں پائے تھے۔ مگر وہ اتنے ہی ہشاش بشاش نظر آتے تھے جتنے کہ ڈیزی کے پھول۔

تھانیدار کا بلاوا

شہریوں کی ایک بڑی تعداد میرے پاس پولیس کے خلاف شکایت لے کر آئی ہے کہ کس طرح یہ لوگ پولیس کے ہاتھوں ہراساں کیے جاتے ہیں۔ کچھ واقعات میں پولیس کے جوانوں نے رات گئے ان کے دروازوں پر دستک دی اور فقط اتنا کہا: ''تھانیدار صاحب نے آپ کو پولیس اسٹیشن طلب کیا ہے۔'' جو ان کے ساتھ چلے گئے انہوں نے رات تھانے میں گزاری اور بہت سوں کو مزید کسی قسم کی مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے رشوت دینا پڑی۔ جن لوگوں نے ان کے ساتھ چلنے سے انکار کیا انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئیں اور جب ان بے چاروں نے اگلے دن حکم کی بجا آوری کی تو انہیں گھنٹوں انتظار کروایا گیا' نہایت بیہودہ قسم کے سوالات پوچھے گئے اور چھوڑنے سے پہلے تنبیہہ کی گئی کہ ہوسکتا ہے انہیں پھر بلالیا جائے۔ قانون کی پاسداری کرنے والے کسی بھی شہری کو باغی بنانے کے لیے ایسا ایک واقعہ ہی کافی ہوتا ہے کیا پولیس کو حکومت کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت کے حوالے سے اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں ہے؟

اس مسئلہ پر قانون بالکل واضح ہے کوئی بھی تھانیدار صاحب کسی بھی شخص کو زبانی کلامی پیغام دے کر پولیس اسٹیشن طلب نہیں کرسکتا ہے۔ ایسا صرف سمن یا تحریری وارنٹ کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ ایک شہری ان پولیس والوں کو جو اسے بغیر کسی وجہ کے پکڑنے کے لیے آئیں ''بھاڑ میں جاؤ'' کہنے میں حق بجانب ہے۔ اگر وہ ان کے بلانے پر چلا جاتا

ہے تو اسے اس بات پر اصرار کرنا چاہیے کہ وہ اپنے وکیل کے آنے تک کسی سوال کا جواب نہیں دے گا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کچھ افراد میں پولیس کا سامنا کرنے کی جرأت ضرور ہوگی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کچھ پولیس والے ان لوگوں سے بھی نپٹنا جانتے ہیں جو ان کے غیر مہذبانہ ہتھکنڈوں کے خلاف ڈٹ جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عملی میدان ہے جہاں پریس پولیس کے اختیارات کے بے جا غلط استعمال کے واقعات کو اخبارات میں جگہ دے کر مثبت کردار ادا کرسکتی ہے اور عام شہریوں میں دھیرے دھیرے اس اعتماد کی ترویج کرسکتی ہے کہ وہ خود کو قادر مطلق سمجھنے والے تھانیدار کو ''نہیں'' کہہ سکتے ہیں۔

❖ O ❖

من حیث القوم

اگرچہ ہم سب ملکی سالمیت کو درپیش خطرات کے معاملے میں نہایت طاق ہو چکے ہیں لیکن اس کے فروغ کے لیے کوئی بھی کسی نئی جہت کے ساتھ سامنے نہیں آتا۔ اس موضوع پر ہونے والی ہر کانفرنس میں آپ کو ایک جیسی باتیں سننے کو ملیں گی۔ تاریخ کی کتابوں پر نظر ثانی کی جائے' دوسرے طبقات کے ساتھ ان کے مذہبی تہواروں میں شرکت کی جائے' اپنی زبان کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانیں سیکھی جائیں' اپنی ذات اور مذہب سے باہر شادی بیاہ کے بندھن قائم کیے جائیں وغیرہ وغیرہ۔ تاہم بمبئی میں ہونے والے ایک سیمینار کے دوران جس کا اہتمام انسٹیٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن کی مہاراشٹر برانچ نے کیا تھا وہاں ڈاکٹر آلو داستر ایک ایسی تجویز کے ساتھ سامنے آئیں جو قومی سطح پر زیر بحث لائے جانے کی مستحق ہے۔ انہوں نے اس بات کی تائید کی کہ اگرچہ ہندی کو ہر کوئی ہماری قومی زبان سمجھتا ہے مگر سرگرم ہندی والوں کے ''زبردستی حلق میں اتارنے والے'' رویے کی وجہ سے جنوبی علاقوں کی ریاستوں نے اسے مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے۔ اگر شروعات دیوناگری کو بطور قومی رسم الخط اپنا کر کی جائے تو مخالفین کی تعداد اتنی نہیں رہے گی جتنی کہ اس وقت ہے۔ پنجابی' گجراتی اور بنگالی جیسی زبانوں کا رسم الخط دیوناگری ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ میں گورمکھی رسم الخط سے شناسائی کی بنا پر بغیر کسی دقت کے ہندی پڑھ سکتا ہوں۔ بنگال یا گجرات میں مجھے بنگالی یا گجراتی میں لکھے ہوئے اشتہارات

پڑھنے کے قابل ہونے میں دو دن سے زیادہ نہیں لگے۔ رسم الخط کی بڑی تقسیم ایک بار پھر جنوبی وندھیاؤں کو درپیش ہوگی۔ کیا تیلگو' کناڈ' تامل اور ملیالی لوگ اپنی زبان کو دیونا گری رسم الخط میں لکھنے کے لیے رضامند ہو جائیں گے؟ اگر انہیں تو کیوں نہیں؟ مہاراشٹر کابینہ کے تامل رکن جناب ڈاکٹر سبرامنیم نے ایک متبادل تجویز پیش کی۔ ان کے خیال میں دیونا گری کی بجائے رومن انداز تحریر پورے ہندوستان کو زیادہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہم اپنے لوگوں کو یورپ' کینیڈا' امریکہ اور لاطینی امریکہ میں رائج رسم الخط سے روشناس کروا سکیں گے۔ انہوں نے رومن اردو کے استعمال کا حوالہ دیا جسے ہماری فوج برطانوی راج کے دوران استعمال کرتی تھی۔ آج بھی بہت سے لوگ سرگرم ہیں جن میں سے ایک نمایاں نام دانیال لطیفی کا ہے جنہوں نے ہندوستانی لہجے کی ادائیگی میں درپیش مشکلات پر قابو پانے کے لیے کچھ علامتیں متعارف کروائی ہیں جو کہ انگریزی میں نہیں ہیں۔ میں نے عربی' دیونا گری یا گورمکھی رسم الخط کی بجائے انگریزی (رومن) حروف تہجی میں لکھی ہوئی اردو' ہندی اور پنجابی کو پڑھنے میں زیادہ آسانی محسوس کی ہے۔ قومی رسم الخط کے لیے آپ کس کی حمایت کرتے ہیں: انگریزی (رومن) یا دیونا گری؟

دہشت گردی کے بنیادی اسباب

چونکہ پنجاب میں دہشت گردی نے ایک بار پھر سر اٹھانا شروع کر دیا ہے لہٰذا یہی وقت ہے کہ ہم اس مظہر پر نظر ثانی کریں' ایک علمی نگاہ دوڑائیں اور دیکھیں کہ آیا ہم اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے کیا تدابیر اختیار کر سکتے ہیں۔ بنگلور کے ہوائی اڈے پر پولیس کے ایک ریٹائرڈ ڈائریکٹر جنرل این۔ ایس سکسینا سے ہونے والی اتفاقی ملاقات نے میری اسی خواہش کو مزید جلا بخشی۔ انہوں نے مجھے اپنی کتاب

Terrorism, History and facts in the world and in India

پیش کی۔ دلی تک آنے والی اڑھائی گھنٹے کی پرواز کے دوران میں نے اس کتاب میں ہندوستان کے متعلق لکھے گئے حصوں کو پڑھ ڈالا۔

سب سے پہلے یہ بات واضح طور پر ہمارے علم میں ہونی چاہیے کہ دہشت گردی دراصل ہے کیا۔ اس عام فہم تصور کو کہ یہ ریاست کے خلاف منظم تشدد کی تحریک ہوتی ہے' اس حقیقت نے باطل ثابت کر دیا ہے کہ اکثر و بیشتر ریاست بذات خود دہشت پھیلا کر حکومت چلاتی ہے۔ ہم فاشسٹ' کمیونسٹ اور دوسری آمرانہ حکومتوں سے بخوبی واقف ہیں جنہوں نے اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے لوگوں کے اندر خوف کی جڑیں مضبوط کیے رکھیں۔ حتیٰ کہ جمہوری معاشروں میں بھی اقلیتوں پر برا بھلا تسلط قائم رکھنے کے لیے تشدد کا استعمال کیا گیا یا پھر ان تنظیموں کی جانب سے آنکھیں بند کر لی گئیں جنہوں نے

اقلیتوں کو ایذا میں مبتلا کیے رکھا۔ مثال کے طور پر سیاہ فاموں اور یہودیوں کے خلاف کلو۔کلس۔کلین (KKK) کا تشدد۔ ہندوستان میں اکثر و بیشتر حکومتیں جعلی پولیس مقابلوں اور قتل و غارت کی حوصلہ افزائی کر کے اپنے مخالف عناصر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے دہشت گردی کو بطور حربہ استعمال کرتی ہیں یا پھر پولیس کو حکومت کے پسندیدہ مذاہب کے ماننے والوں کی طرف سے دوسروں کے خلاف تشدد کے استعمال کے موقع پر خاموش تماشائی بنے رہنے کی ہدایات دی جاتی ہیں۔ ہندو مسلم فسادات میں تو اس بات نے مسلمہ امر کی صورت اختیار کر لی ہے اور اس حقیقت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آزادی سے لے کر اب تک کے ہونے والے تصادم میں مسلم جان و مال کا زیاں ہندوؤں کی نسبت دس گنا زیادہ ہے۔ دہشت گردی کی طرف سے پولیس کی چشم پوشی کی بدترین مثال مسز گاندھی کے قتل کے دو روز بعد سامنے آئی تھی سکسینا لکھتا ہے:

> دلی' کانپور' غازی آباد وغیرہ جیسے علاقوں میں پولیس یہ تاثر دے رہی تھی کہ جسے سکھ کش فسادات کو حکومت کا آشیرباد حاصل تھا۔ یہ تاثر قابل جواز بھی تھا کیونکہ پولیس لوٹ مار' اجتماعی آبروریزی' عمارتوں کو نذر آتش کر دینا اور قتل و غارت جیسے واقعات کے دوران نہ صرف خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی بلکہ اس نے قاتلوں' لٹیروں اور عصمت دری کرنے والوں کے خلاف شکایات درج کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں اعتراف کیا تھا کہ صرف دلی میں 2400 افراد مارے گئے تھے (اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی) جبکہ دلی پولیس نے صرف 359 کیسوں کا اندراج کیا تھا۔ مجسٹریسی بھی برابر کی قصوروار تھی اور ننانوے فیصد مجرم جن پر ناقابل ضمانت جرائم کے الزامات تھے درحقیقت ضمانت پر رہا ہو چکے تھے اور وہ جن لوگوں کو انہوں نے قتل کیا تھا ان کے رشتہ داروں کو ڈرانے دھمکانے اور تنگ کرنے میں مصروف ہیں کہ کہیں وہ لوگ ان کے خلاف ثبوت فراہم نہ کر دیں۔ سکسینا یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ ''زیادہ تر دہشت گردی عوامی حلقہ کی مہم جوئی ہوتی ہے۔''

سکسینا کے مشاہدات میں سے ایک اور مشاہدہ بھنڈراں والا طرز کی دہشت گردی کی وضاحت کرتا ہے۔ ''جب عوام الناس دہشت گردی کا نشانہ بننے والوں کے ساتھ عملی اظہار ہمدردی نہیں کرتے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ وہ ٹی وی اور اخبارات میں منظر عام پر لائی جانے والی دہشت گردی کی سرگرمیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ صنعتی رؤسا اور ارب پتی لوگوں کا اغواء عموماً اسی زمرے میں آتا ہے ایک امریکی ماہر نفسیات نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ دہشت گردی اجتماعی تفریح کی ایک شکل ہے۔'' سکھ کاشتکاروں کی بھنڈراں والے کا نشانہ بننے والوں کے ساتھ ہمدردی اس حد تک نہیں تھی کہ بھنڈراں والے کی ذات سے گھن آنے لگتی۔ اس ہمدردی میں ہونے والا اضافہ بتدریج تھا۔ ہمدردی کے اس بتدریج اضافے کی وجوہات میں بزرگ اور عالمانہ شخصیت گیانی پرتاب سنگھ کا قتل' سنت لونگووال کا قتل اور اس سے بھی بڑھ کر گرونانک کے جنم دن کے موقع پر سرہند کے مقام پر عظیم بزرگ گیانی صاحب کے قتل کی کوشش شامل تھیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بھنڈراں والے کی دہشت گردی کا آخری باب رقم کیا جا چکا ہے۔ آیا پولیس کی طرف سے تخریبی عناصر کی سرپرستی بھی اختتام کو پہنچنے والی ہے۔ میں اس کے متعلق یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔

تاریخ کے قاتل

فرقہ واریت کے سر اٹھانے پر ہم سب پریشان ہیں۔ ہم سب اس بات پر بھی متفق ہیں کہ ہمیں مزید بہتری کے لیے اپنی تاریخ کی درسی کتب میں سے مذہبی عناد کو خارج کر دینا چاہیے۔ ابھی تک اس بات پر سنجیدگی سے کام کرتا ہوا کوئی دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اس کے برعکس فرقہ وارانہ تعصب کے تحت لکھی جانے والی کتب میں اضافہ ہوتا دکھائی دیتا ہے اور انہیں قبولیت بھی مل رہی ہے۔ جب پی۔ این۔ اوک اپنی دھرم یدھ کو منظر عام پر لایا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندوازم کے لیے مفید ہر شے ہندوستان کی ملکیت تھی اور ہمارے مسلمان حکمرانوں کے حصے میں صرف تہذیب سوزی ہی آئی تھی تو میں نے سوچا کہ جب یہ صاحب بذات خود اپنے آپ کو احمق بنا رہے ہیں تو پھر کسی دوسرے کو اس کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی کتابوں میں موصوف بضد تھے کہ آگرہ کا تاج محل اور دلی میں واقع قطب مینار ہندوؤں کی یادگاریں ہیں۔ اس نے تاریخ دانوں کے ریکارڈ میں موجود اور ان یادگاروں پر سہروں کی صورت میں سجی ہوئی قرآن پاک کی سورتوں سے مکمل چشم پوشی اختیار کر لی تھی۔ تاہم جب میں نے اوک کی کتابوں کو تاج محل اور قطب مینار کے باہر فروخت ہوتے ہوئے پایا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اوک کوئی ہنسی مذاق کا قصہ نہیں ہے اور اس کے تاریخ کو اس طرح جان بوجھ کر مسخ کرنے پر میں نے چند سخت مضامین بھی لکھے تھے۔ اب میں ایک شریف آدمی میں اوک

کے ہونہار جانشین ہونے کی جھلک دیکھ رہا ہوں جو اپنا تعارف پروفیسر امرناتھ کے طور پر کرواتا ہے۔ اس کی کتاب ''Some Missing Chapters of world History'' میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نہ صرف مسلمانوں کی آمد سے قبل کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک کی قابل تحسین یادگاریں بلکہ انگلستان میں موجود ہر شے بشمول ویسٹ منسٹر کی خانقاہ کے ہندو اساس کی مرہون منت ہے۔ ایسی علمی گستاخی حقیقتاً دم سادھ لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

تاریخ کی شکل بگاڑنے کے ضمن میں کچھ ایسی مثالیں میں بھی پیش کر سکتا ہوں جن کا میں نے بذات خود سامنا کیا ہے۔ آگرہ میں جمنا کے کنارے واقع اعتماد الدولہ کے مقبرہ کے پہلو میں مغلیہ طرز کا ایک باغ موجود ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بابر کی میت کو اس کے لیے کابل میں منتخب کی گئی آخری آرام گاہ میں منتقل کرنے سے پہلے امانتاً دفنایا گیا تھا۔ اس باغ کا نام ''آرام گاہ'' رکھا گیا تھا' وقت کے ساتھ ساتھ وہ گنوار لوگ جنہیں فارسی لفظ کو ادا کرنے میں دقت ہوتی تھی اسے رام باغ پکارنے لگے۔ ''ایک باغ جس کا نام رام سے منسوب ہو کس طرح مغلیہ ہو سکتا ہے؟'' لوگ پوچھنے لگے۔ اس بات کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا' جب اوک اور امرناتھ طرز کے کسی تاریخ دان نے اس غلط تلفظ کو اس کے ہندو ملکیت ہونے کے فیصلہ کن ثبوت کے طور پر استعمال کیا ہوگا۔

دلی کی پہاڑی پر ایک قدیم عمارت موجود ہے جو کہ ''بھولی بھٹیاری کا محل'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ برتن بنانے والی اس فرضی عورت کے گرد بہت سی کہانیاں گھڑ لی گئیں ہیں۔ درحقیقت یہ عمارت ایک نسبتاً غیر معروف مسلمان کا مزار ہے جس کا نام بوعلی بھٹی تھا۔ اس معاملے میں بھی یہ سب کچھ گنوار لوگوں کا کیا دھرا تھا جو یہاں مدفون اس عمارت کے حقیقی تعمیر کنندہ کے نام کی ادائیگی میں درپیش مشکل کی وجہ سے تھا۔

پروفیسر (میں حیران ہوں کہ اسے پروفیسر بنایا کس نے تھا) امرناتھ اس جاہلانہ بحث کی پیروی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ کرسمس کا عیسیٰؑ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا نام کرشن کے نام سے اخذ کیا گیا ہے۔ دراصل اس کا ماخذ کرشن ماس (کرشن کا مہینہ) کا لفظ ہے۔ آپ جناب اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ انگریزی سنسکرت ہی کی ایک خاص زبان

ہے اور یہ کہ پوپ (Pope) کبھی ہندو پجاری ہوا کرتا تھا اور ویسٹ منسٹر کی خانقاہ شو کا ایک مندر تھی۔

اس قسم کی تواریخ کو ہر کوئی فضول بکواس سمجھ کر ماننے سے انکار کردے گا۔ جب میں نے ایک طبقہ کی یادگاروں کو دوسرے طبقے کے نام سے منسوب ہوتا ہوا دیکھتا ہوں تو یہ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ یہ مزید فساد برپا کریں کیا ان کا سدباب کرنے کا یہی مناسب وقت نہیں ہے۔ میں کتابوں کی اشاعت پر پابندی لگانے کے خلاف ہوں ماسوائے ان کتابوں کے جو جھوٹ یا فحاشی کو فروغ دیتی ہیں۔ اوک اور امرناتھ کی کتابیں جھوٹی بھی ہیں اور فحش بھی کیونکہ انہوں نے ملک کی طبقاتی ہم آہنگی کو رسوا کیا ہے۔

❖ O ❖

کیسا آئین؟

سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے متعلق کافی کچھ لکھا جا چکا ہے جو کہ بہار حکومت کے خلاف من پسند گورنروں کے ذریعے حکومت چلانے پر دیوان چند وادھوا کی طرف سے کی گئی رٹ پر سنایا گیا تھا۔ بہار کی حکومت من پسند گورنروں کا چناؤ اس لیے کرتی تھی کہ ودھان سبھا میں لے جا کر تجویز شدہ قانون سازی اور اس کی منظوری حاصل کرنے کی بجائے دوبارہ سے آرڈیننسوں کا نفاذ کیا جا سکے۔ چند سال قبل میں نے اس کے متعلق لکھا تھا جب وادھوا کی کتاب "Repromulgation of Ordinances: A fraud on the Constitution of India" پہلی مرتبہ چھپی تھی اور میں نے راجیہ سبھا میں ہونے والے مباحثوں کے دوران کئی مرتبہ اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ ان آئینی شرائط کے شرمناک حد تک غلط استعمال پر حکومت نے بالکل لاتعلقانہ رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔ پانچ سالوں تک وادھوا نے یہ جنگ تن تنہا لڑی جبکہ صرف پریس اس کی مدد کو موجود تھی۔ بالآخر وہ اس سارے معاملے کو اٹھا کر سپریم کورٹ لے گیا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ عدالت میں اس کی پیروی کے لیے سولی سوراب جی رضا مند ہو گئے تھے جو کہ انسانی حقوق کے معاملات میں فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں سولی کا شمار ملک کے مہنگے ترین وکلاء میں ہوتا ہے؛ اس نے وادھوا کی بلا معاوضہ پیروی کی اور اس کیس کی مد میں خرچ ہونے والے 10,000 روپے بھی دلوائے۔

میں اس کیس سے منسلک ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ قریباً دو سال قبل ایک نوجوان بیرسٹر سلمان خورشید (اس وقت کے وزیر خورشید عالم جان کے صاحبزادے) نے دلی کے امپیریل ہوٹل میں آئین پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا تھا۔ سابق جسٹس وائیم پی بہار الاسلام نے صدارت کی تھی۔ اس وقت کے وزیر قانون جگن ناتھ کوشل نمایاں مقرر تھے۔ انہوں نے نہایت شاندار خطاب کیا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ ہمارا آئین کس قدر مستحکم تھا اور کس طرح ہر شہری کا یہ فرض تھا کہ وہ اس کی دفعات کا احترام کرے۔

مجھے وہ راستہ مل گیا جس کا کہ میں انتظار کر رہا تھا۔ جب میری بولنے کی باری آئی تو میں نے کہا کہ آئین کو تباہ کرنے کے دو طریقے ہیں؛ اول وہ ناشائستہ طریقہ جس پر بادل جیسے اکالی عمل پیرا ہوئے یعنی اس نے آئین کی ایک کاپی کو سرعام نذر آتش کیا (اس مثال کی حال ہی میں ڈی ایم کے پارٹی کے عہدیداران نے نقل اتاری تھی) اور دوئم وہ مہذب طریقہ کار جس میں اس کی تعریف و توصیف بیان کی جاتی ہے اور پھر اس کے تقدس کو پامال کیا جاتا ہے۔ اس دوسرے طریقہ کار کے نقائص بہار حکومت نے دور کر دیئے تھے۔ وزیر قانون کوشل اس وقت بہار کے گورنر تھے۔

مجھے یہ جان کر سخت حیرانی ہوئی کہ کوشل کا نام نہ تو بحث میں سنائی دیا اور نہ ہی فیصلے میں سامنے آیا کیونکہ یہ وہی تھا جس نے کسی دوسرے گورنر کی نسبت آئین کی ہنگامی دفعات کی سب سے زیادہ دھجیاں اڑائی تھیں۔ آئین کے مطابق گورنر کا صرف اس بات پر مطمئن ہونا ضروری تھا کہ تجویز کردہ آرڈیننس واقعی ضروری تھا۔ کوشل نے کئی مرتبہ خود کو مطمئن کرنے کے لیے ایک دن میں پچاس سے زائد آرڈیننسوں کی تجدید کی تھی؛ 18 جنوری 1976ء کو اس نے 56 نہایت مختلف نوعیت کے موضوعات پر 56 آرڈیننس جاری کر کے خود کو مطمئن کیا تھا۔ یہ تو واضح تھا کہ ان سب کو تو وہ ایک دن میں پڑھ بھی نہیں سکتا تھا۔ حالانکہ یہ اطمینان کے درجے پر پورے نہیں اترتے تھے البتہ یہ سب ضروری تھے۔ بحیثیت عوام ہمارا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ غلط ہے۔ بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ہم خود کو مصیبت سے بچانے کے لیے غلط کرنے والے ساتھ متفق ہو جاتے ہیں۔

کانگریس اور بی جے پی: کون کیا ہے

لوک سبھا کی نشستوں کے لیے کاغذات نامزدگی داخل کروانے کی آخری تاریخ سے ایک روز پہلے بی جے پی کے وجے کمار ملہوترا نے جو کہ بذات خود ایک امیدوار ہیں' مجھے فون کیا اور نئی دلی کی نشست کے لیے ایل کے ایڈوانی کا نام پارٹی کے صدر کے طور پر نامزد کرنے کے متعلق مجھ سے میری رضامندی دریافت کی۔ بغیر کسی توقف کے میں نے جواب دیا: ''یہ میرے لیے ایک اعزاز کی بات ہوگی۔''

ریسیور کے واپس رکھتے ہی دل میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ میں نے بی جے پی کا نقطۂ نظر تو اس سے پوچھا ہی نہ تھا۔ خاص طور پر بابری مسجد کے رام جنم بھومی ہونے کے مسئلے پر اور پارٹی کے اردو زبان کو بحیثیت دوسری بڑی زبان تسلیم کرنے کی مخالفت پر تو بالکل ہی کوئی بات نہیں ہو سکی تھی۔ پارٹی کھلم کھلا اپنے ہندو تشخص کی شیخی بگھار رہی تھی اور اس کے رہنماؤں نے متنازعہ زمین پر نئے مندر کی بنیادیں قائم کرنے کے لیے ایودھیا سے اینٹیں لے کر آنے کی پوجا میں باقاعدہ طور پر حصہ لیا تھا۔ تاہم میں ایڈوانی اور ملہوترا کے بے داغ کرداروں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں ایڈوانی کی کارکردگی راجیہ سبھا میں دیکھ چکا تھا اس کا شمار واضح ترین سوچنے والوں اور دبنگ مقررین میں ہوتا تھا۔ میں اسے ایک صاف ستھرے اور ایماندار آدمی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ کسی قسم کا سکینڈل خواہ وہ مالی ہو یا اخلاقی اسے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ اپنی پرانی یادوں میں اس کی جنتا حکومت میں

بحیثیت وزیر سر انجام دی جانے والی کارکردگی اور اس کے علاوہ میری اس کے ساتھ ہونے والی بات چیت جو کہ میں نے اس کے ساتھ لابی میں کی تھی' ان مختلف ادوار کے دوران میں نے اس کی شخصیت میں کسی قسم کے طبقاتی تعصب کا سراغ نہیں پایا تھا۔

گھٹنے کی چوٹ سے اچانک پیدا ہونے والے کسی ردعمل کی طرح جس بات نے شاید مجھے اس کا نام تجویز کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ نومبر 1984ء میں مسز گاندھی کے قتل کے بعد رونما ہونے والا سکھوں کا قتل عام تھا۔ اس بات پر یقین کرنے کے لیے میرے پاس مضبوط دلیل موجود تھی کہ یہ پیغام کہ ''سکھوں کو سبق سکھاؤ'' کانگریس پارٹی کے اعلیٰ عہدیداران کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ ان تین المناک دنوں میں پولیس اور نیم فوجی اداروں کی مجرمانہ سستی' حکومت اور فسادیوں کی ملی بھگت کا واضح ثبوت تھی پولیس کے مسلح جوان نہ صرف بیکار تماشائی بنے ہوئے تھے بلکہ اکثر و بیشتر گردواروں کو نذر آتش کرنے' سکھوں کو قتل کرنے اور ان کی عورتوں کی آبروریزی کرنے اور ان کے مال واسباب لوٹنے کے لیے ٹھگوں کے گروہوں کو اکساتے بھی تھے۔ آہنی ہاتھوں کے استعمال سے جو کچھ روکا جا سکتا تھا اسے جان بوجھ کر 72 گھنٹے تک جاری رہنے دیا گیا تھا۔ مذمت کرنا تو درکنار اپنے پہلے عوامی جلسہ سے خطاب کے دوران راجیو گاندھی نے اس کی وضاحت اس طرح سے کی'' جب ایک تناور درخت زمین بوس ہوتا ہے تو آس پاس کی زمین دہلتی ضرور ہے۔'' جن اطوار کا مظاہرہ کانگریس نے الیکشنوں کے دوران کیا وہ بھی اتنے ہی قابل مذمت ہیں جتنا کہ قتل عام کے دوران اختیار کیا جانے والا رویہ تھا۔ اس کے پوسٹروں میں سکھوں کے خلاف ایک واضح عناد موجود تھا۔ مثال کے طور پر یہ اشتہار کہ: ''کیا آپ کسی ایسی ٹیکسی میں خود کو محفوظ تصور کرتے ہیں جسے کسی اور مذہب کا فرد چلا رہا ہو؟'' اس کے اپنے حلقہ انتخاب امیٹھی میں جہاں اس کی سالی مانیکا اس کے مدمقابل تھی وہاں لگائے جانے والے نعروں میں سے ایک نعرہ یہ بھی تھا:

''بیٹی ہے سردار کی' قوم ہے غدار کی۔''

اپنے پیدا کردہ سکھ مخالف تاثر کی مدد سے کانگریس نے اپنی سیاسی شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا تھا۔ تین غیر سرکاری انکوائری کمیشن جن کی سربراہی سپریم کورٹ کے

ریٹائرڈ چیف جسٹس ایس ایم سیکری، جسٹس ترکنڈی اور کوتھری (ان میں سے ایک بھی رکن سکھ نہیں تھا) کر رہے تھے ان تینوں کمیشنوں نے کانگریس پارٹی کو سکھ کش فسادات برپا کرنے پر شدید قصوروار ٹھہرایا تھا۔ ''قصوروار کون؟'' کی اشاعت میں کانگریس کے بہت سے پارلیمانی اراکین کے نام شامل تھے۔ ان میں سے دو ایچ کے ایل بھگت اور جگدیش ٹیٹلر مرکزی کابینہ میں شامل تھے۔ ایک سرکاری تفتیش کا آغاز کرنے کے لیے راجیو گاندھی نے راز افشا کر دینے والی غیر آمادگی کا اظہار کیا۔ بالآخر چھ ماہ کی تاخیر کے بعد وہ اس تفتیش کو اکالی پارٹی کے ساتھ ہونے والی سودے بازی کے ایک جزو کی شکل میں قائم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ کمیشن کی سربراہی کرنے والے جسٹس رنگاناتھن مشرا نے اپنا پورا وقت لیا اور قصوروار کا نام منظر عام پر لانے کے لیے مزید دو کمیشن بٹھانے کی سفارش کی۔ پھر دہلی ہائیکورٹ نے اس کمیشن کو بھی روک دیا تھا۔ لہٰذا ہم گھوم پھر کر واپس اسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سے یہ سب شروع ہوا تھا۔ کسی ایک بھی ایسے شخص کو سزا دیئے بغیر جو کہ بلاشبہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ہونے والے معصوم لوگوں (بلا مبالغہ 10,000 افراد) کے بہیمانہ قتل کے بدترین واقعہ کا ذمہ دار تھا۔

کانگریسی حکومتوں نے جن ریاستوں میں حکومت چلائی تھی وہاں بھی ان کا ریکارڈ نہایت پرلے درجے کا ہے۔ ہاشم پورہ میں 70 سے زائد مسلمان کسانوں کا سفاکانہ قتل، احمد آباد میں اور مدھیا پردیش کے قصبوں میں اور حال ہی میں بھاگل پور میں ہونے والے مسلم کش فسادات اس کے سیکولر ہونے کے دعووں کو باطل ثابت کرتے ہیں۔ ان سب باتوں نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا کہ میں کانگریس کے علاوہ کسی بھی جماعت کو ووٹ دے دوں گا۔ دلی کے ایک شاعر شجاع خاور کا یہ شعر میرے رویے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

کیا رکھا ہے اس حلقۂ احباب میں لیکن
ہم تم سے نہ ملنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں

فارسی کی مشہور ضرب المثل کے مطابق ''حب علی نہیں، بغض معاویہ'' کی خاطر میں نے بی جے پی کی حمایت کا فیصلہ کیا۔

کسی بھی شخص کو سیاسی جماعتوں کو نہ تو ان کے کوٹ کے کالروں پر لگے لیبلوں اور نہ ہی ان کے جاری کردہ بلند و بانگ قسم کے منشوروں کے ذریعے پرکھنا چاہیے بلکہ ان کی پہچان ان کے کاموں سے کرنی چاہیے میں ایک مرتبہ پھر نومبر 1984ء کی قتل و غارت کی طرف آتا ہوں' جب کانگریس برسراقتدار تھی تو غنڈے سکھوں کو لوٹنے اور قتل کرنے میں مصروف عمل تھے۔ ایسے میں جو لوگ ان بے چاروں کی مدد کے لیے آگے بڑھے ان میں صرف بی جے پی اور آر ایس ایس کے اراکین شامل تھے۔ اٹل بہاری واجپائی اپنے بستر علالت سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے تاکہ ان غنڈوں کے ساتھ لڑسکیں جو سکھ ڈرائیوروں کی ٹیکسیوں کو جلا رہے تھے۔ سکھ دہشت گرد جو لدھیانہ اور موگا میں RSS کے ارکان کو گولیوں کا نشانہ بنا کر سکھوں کے خلاف ڈھالے جانے والے ہندوؤں کے ظلم و ستم کا حساب برابر کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت اپنے ناپاک عزائم میں ناکام ہوگئے جب آر ایس ایس ان کے چنگل میں نہ آسکی۔

اب کیا کوئی شخص کسی پارٹی کو ایمانداری سے کہہ سکتا ہے کہ یہ سیکولر پارٹی ہے اور یہ فرقہ وارانہ' جب نئی دلی میں میرے افراد خانہ اور احباب ہر صبح مجھے "جے رام جی کی" کہہ کر طنزاً مخاطب کرتے ہیں تو میرے نقطہ نظر کے مطابق دونوں ہی ووٹ ڈالنے کے اختیار میں محدود نظر آتے ہیں۔ میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔ ہماری اولین ترجیح ملک کو کانگریس پارٹی کی حکومت سے نجات دلانی ہے لہٰذا میں ایڈوانی کا نام تجویز کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ بڑی اکثریت سے جیتیں گے۔

اس بات سے ہم بخوبی آگاہ ہیں کہ اگر فرقہ وارانہ تعصب اسی طرح سے پھیلتا رہا جیسا کہ آج پھیل رہا ہے تو اس کا نتیجہ ہمارے ملک کی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ ہمارے پاس اب بھی وقت ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے اس کی جڑوں کو تلاش کریں جب سے ہم آزاد ہوئے ہیں اس کے بعد سے اس نے کون کون سے رخ اختیار کیے ہیں' اس کے بارے میں معلوم کریں' اس موذی زہر کا موجودہ شکل میں مکمل تجزیہ کریں اور اس کے تریاق کو تلاش کریں جو اس موذی زہر کو مزید پھیلنے سے روکے گا۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے علاوہ دوسرے طبقات کے متعلق کسی نہ کسی طرح اپنے

رسمی نوعیت کے نظریات پر قابو پانا چاہیے۔ آزادی تک فرقہ ورانہ مسئلے کا مطلب صرف مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ غیر مسلم کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ مسلمان متعصب' سر پھرے اور دھوکے باز تھے۔ ہماری پرورش پرتھوی راج چوہان' مہارانا پرتاب' گرو گوبند سنگھ اور شواجی کی بہادری کی داستانیں سن کر ہوئی تھی۔ ہمارے تمام ہیرو غیر مسلم تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کی تھی۔ ہمارے دیوتاؤں میں سے ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ مسلمان فاتحین نے جو کچھ کیا تھا اس کے ہمارے سامنے ثبوت پیش کیے جاتے تھے۔ ہمارے مندروں کے تقدس کو پامال کیا' ہمارے شہریوں کا قتل عام کیا اور ان پر ذلت آمیز ٹیکس لگائے گئے اگرچہ یہ سب برطانوی راج کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا مگر مسلمانوں کے خلاف اس بداعتمادی کو دل ہی دل میں پروان چڑھاتے رہنا جاری رہا۔ جو ذرا زیادہ آزاد خیال تھے انہوں نے کسی مسلمان کے ساتھ دکھاوے کے طور پر دوستی قائم کر لی تھی لیکن ایسا بہت کم تھا کہ ہم نے ان کی ہمراہی میں سکون محسوس کرنا اور اپنی سوچ کو زبان پر لانا سیکھا ہو۔ وہ ہندوستان کی اکثریت کا حصہ نہ تھے۔ جناح کو دوقومی نظریہ ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی بلکہ یہ تو کسی بھی دیکھنے والی آنکھ کے لیے پہلے سے ہی موجود تھا۔ مسلمانوں کا نا صرف مذہب بالکل مختلف تھا بلکہ انہیں ان کے ناموں سے بھی پہچانا جا سکتا تھا آپ ایک ہندو اور ایک سکھ میں فرق نہیں کر سکتے کیونکہ راجپوت' جٹ' سکھ' گورکھے بنئے اور دوسرے بہت سوں کے نام ایک جیسے ہیں جبکہ مسلمانوں میں ایسا نہیں ہے۔ انہیں ان کے الگ لباس' ان کی دستار' ان کی غذا اور انداز و اطوار سے بھی پہچانا جا سکتا تھا۔ طبقات کے درمیان پائی جانے والی دوریوں کو برطانویوں نے بہت جلد بھانپ لیا تھا اور جیسا کہ کوئی بھی دوسری خارجی طاقت اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتی تھی انہوں نے بھی اسے اپنے مفاد کے لیے خوب استعمال کیا تھا۔ جیسا کہ مولانا محمد علی نے کہا تھا' برطانویوں نے ہمیں تقسیم کر کے ہم پر حکومت نہیں کی بلکہ ہم نے بذات خود اپنے آپ کو تقسیم کیا ہے اور انہوں نے ہم پر حکومت کی ہے۔

1946-47ء تقسیم کے وقت ہونے والی فرقہ وارانہ قتل و غارت نے ہمارے ذہنوں میں دو ابہام پیدا کیے۔ ہم نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو ان کا پاکستان مل گیا تھا اور

باقی ماندہ مسلمان جو آبادی کا گیارہ بارہ فیصد تھے انہیں ہندوستان کی اکثریت میں آسانی سے مدغم کیا جا سکتا تھا اور یہ کہ کسی نہ کسی طرح گاندھی ازم کا عملی تجربہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کے آتش فشاں کو پھوٹ پڑنے سے روک سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے دونوں امیدیں غیر حقیقی ثابت ہوئیں۔ فرقہ وارانہ زہر کو دوبارہ پہلے سے زیادہ مہلک شکل میں پھوٹ پڑنے اور ملک کے بیشتر علاقوں کو تکلیف میں مبتلا کر دینے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ مہاراشٹر، گجرات، کرناٹک اور تامل ناڈو کا وسیع علاقہ اس سے متاثر ہوا۔

آزادی کے بعد ایک نیا واقعہ ذاتوں کے مابین ہنگاموں کی صورت میں رونما ہوا۔ ہری جنوں کے خلاف پہلے بھی محدود پیمانے پر تشدد کا استعمال کیا گیا تھا جس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ آزادی کے موقع پر ہریجنوں میں امید کی نئی لہر اور عروج حاصل کرنے کی تمنا پروان چڑھی تھی اور انہوں نے اپنے حقوق کے لیے پرشور مطالبات کا آغاز کر دیا تھا۔ ان مطالبات کے خلاف ہندو ذات پات کے لوگوں نے مدافعت کی تھی نتیجتاً فسادات شروع ہو گئے۔ یہ سب کچھ بالکل یکطرفہ تھا کیونکہ ہریجن کسی قسم کی بھی مدافعت کے قابل نہ تھے۔ پھر ہمارے سامنے ہندوؤں کے مختلف گروہ تھے جو ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے جھگڑنے میں مصروف تھے جیسا کہ Lingyats بمقابلہ Vokkaligas تامل ناڈو میں براہمنوں کے مابین دشمنیاں پھوٹ پڑیں تھیں۔ یعنی Lycrs بمقابلہ lynegars۔ گجرات میں پٹی دار درباریوں کے مقابلے پر تھے؛ دور دراز علاقوں میں واقع دریا کے نزدیک بستیوں میں پھولن دیوی راج کرتی تھی، اس نے ملاح ہونے کے ناتے تقریباً دو درجن "یادو" بھون ڈالے تھے۔ ہندوستان فرقہ وارانہ تعصب کی جس نہج پر پہنچ چکا تھا اس کی سب سے خوفناک مثال آسام میں نیلی کے مقام پر ہونے والا قتل عام تھا۔ قتل و غارت کے اس طویل والمناک پہر میں 3,000 سے زائد مرد و خواتین اور بچے ذبح کر دیئے گئے تھے۔ بنگلہ دیش کے پناہ گزین بنگالی اور آسامیوں کو مار رہے تھے، آسامی اور بنگالی ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے، قبائلی غیر قبائلیوں کا گلا گھونٹ رہے تھے، مسلمان ہندوؤں اور عیسائیوں کو قتل کر رہے تھے جبکہ عیسائی ہندوؤں کی جانیں قبض کر رہے تھے۔ قصہ مختصر، ایسا لگتا تھا کہ ہر کوئی کسی نہ کسی کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔ ہر کسی

کے ہاتھ اپنے ہمسائے کے خلاف اٹھے ہوئے تھے۔

یہ واضح ہو جائے گا کہ ہمارے علاقوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی بنیادی وجہ آبادی میں جان لیوا شرح سے ہونے والا اضافہ ہے' جس نے ہمارے زندہ رہنے کے ذرائع یعنی ہماری زمین اور مکانات کو خوفناک حد تک محدود کر دیا ہے۔ ہمارے شہروں میں ہونے والی خوفناک بھیڑ بھاڑ' جھونپڑپٹیاں اور ہزاروں کی وہ تعداد جو فٹ پاتھوں پر ایک دوسرے کے ساتھ چپک کر سوتے ہیں۔ اس قسم کے حالات میں ذرا سا مشتعل ہونے پر کشیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں' مندروں میں ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے اور تشدد کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس شخص کے خلاف آپ کو شکایت ہے اس کو پکڑنے کی بجائے اپنے ہی طبقے کے لوگوں کے ساتھ ہاتھا پائی کرنا آسان کام ہے' لسانی گروہ تشکیل دیجئے اور ان کے خلاف ہو جایئے جن کا اس سے تعلق نہیں ہے۔

جلتی پر تیل کا کام معاشی محرکات سرانجام دیتے ہیں جن کا تناسب خطرناک حد سے تجاوز کر چکا ہے۔ مراد آباد کے ہنگاموں کا آغاز پنجابی مہاجرین نے کیا تھا جس کا مقصد پیتل کے برتنوں کی صنعت پر مسلمانوں کی اجارہ داری کو ختم کرنا تھا۔ یہی سب کچھ جلگاؤں اور بھوانڈی (مہاراشٹر) میں بھی ہوا جہاں باہر سے آنے والوں نے جن میں اکثریت سندھی اور پنجابی ہندوؤں کی تھی مسلمان بنیؤں کے کاروبار پر قبضہ جمانے کے لیے انہیں تباہ کیا۔ ہریانہ میں ہندوؤں نے سکھوں کی دہشت گردی کے خلاف جوابی کارروائیاں کیں اور پنجاب میں ان کا رُخ پانی پت' کرنال اور یمنا نگر کے سکھ دکانداروں کی طرف تھا۔ ہنگاموں کی طرف مائل حیدر آباد میں ہندو طبقہ مسلمانوں کی جائیداد کے درپے تھا جس میں ایک کھادی بھنڈار بھی شامل تھا' کیونکہ عمارت کا مالک ایک مسلمان تھا۔

پڑھے لکھے بے روزگاروں کی تعداد میں تیزی سے ہونے والا اضافہ بھی ہمارے مسائل کو بڑھا سکتا ہے۔ پنجاب میں ہونے والی دہشت گردی کے پیچھے ان لوگوں کا سب سے بڑا ایک ہی گروہ کارفرما ہے۔ کبھی کبھار یہ گروہ ہندوؤں کے خلاف کام کرتا ہے جبکہ اکثر و بیشتر اس کا نشانہ کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہیں۔ بینکوں اور امیر لوگوں کو لوٹنا ان کے اصل مقاصد ہیں۔ خالصتانی اور ہندو کش نعرے بلند کرنا تو صرف دکھاوے کے لیے ہے۔

صورتحال کافی خوفناک ہے اور دن بدن مزید خوفناک ہوتی چلی جا رہی ہے۔
آخر اس کا کیا سدباب کیا جا سکتا ہے؟
سب سے پہلے ہمیں اس کے ساتھ زندہ رہنے کا ہنر سیکھنا ہوگا۔ گزشتہ بیالیس سال کے تجربات کو ہمیں یہ بات سکھا دینی چاہیے کہ ہم فرقہ واریت کے خاتمے کی خواہش نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس اس کا بہترین حل اس فرقہ واریت کو انتظامی حدود کے اندر محدود کرنا ہے۔ ہم فرقہ وارانہ کشیدگیوں کو کم کرنے کے لیے بہت سے حربے استعمال کر چکے ہیں۔ سب سے مشہور روایتی طریقہ کار وہی رہا ہے جس کے تحت ہم تضحیک آمیز طریقے سے اس بات کا پرچار کرتے ہوئے کہ تمام مذاہب انسانوں کی باہمی محبت پر زور دیتے ہیں اور رام رحیم یا پھر اللہ اور ایشور یعنی ایک ہی ہستیٔ مطلق کے مختلف ناموں سے متعارف کرواتے ہیں۔ یہ سب قابل عمل تھا جب ہمارے ارد گرد مہاتما گاندھی جیسے لوگ موجود تھے کیونکہ وہ اپنی ذات کے اندر اللہ اور ایشور کی علامت بنے ہوئے تھے اب یہ مزید قابل عمل نہیں رہا ہے۔ راجا گوپال اچاری کہا کرتے تھے کہ خدا ہمارا بہترین پولیس والا تھا لیکن اب ایسے لوگ نایاب ہو چکے ہیں؛ جبکہ وہ حضرات جو اپنی مذہبیت کا مظاہرہ مذاہب میں تضادات پر زور دے کر کرتے ہیں ایک عام مظہر کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔
یہ بات نہایت اہم ہے کہ اہم عہدوں پر فائز مرد و خواتین جیسا کہ صدور، وزرائے اعظم، وزرائے اعلیٰ، گورنر اور ان جیسے دوسرے اہم لوگوں کو اپنی مذہبیت کی عوامی نمائش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مہاتما گاندھی جو روزانہ دعاؤں کا اہتمام کرتے تھے وہ کہاں جاتے تھے، مندروں میں نہیں جاتے تھے اور آخری مرتبہ وہ عبادت کے لیے جس جگہ گئے وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مقبرہ تھا جہاں وہ ہندو غنڈوں کی طرف سے مزار کو پہنچائے جانے والے نقصان کی معافی طلب کرنے گئے تھے۔ جواہر لعل نہرو کبھی بھی مزاروں، مساجد یا گردواروں میں نہیں گئے۔ اس کے بعد مسز گاندھی اور ان کے تعینات کردہ نمائندوں نے مذہبی جذبات کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ بھومی پوجا اور ارداسوں کا مظاہرہ عوامی تقریبات میں کیا جاتا ہے۔ بلرام جاکھڑ نے بذات خود درخت پر بیٹھے سادھو کی ٹانگ اپنے ماتھے پر کھائی تھی۔ ہر طرح کے درویش، ماہر

فلکیات' سوامی اور کیسری چوغے میں ملبوس ڈھونگی ہمارے لیڈروں کو مشورہ دیتے ہیں۔

سرکاری میڈیا کے غلط استعمال نے جیسا کہ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ذریعے کیا جانے والا مذہبی پراپیگنڈہ' سائنسی ترقی کی گھڑی کو الٹا چلا کر ملک کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ میں اس الزام کے بیشتر حصے کو رامائن اور مہابھارت جیسی سیریلز کے ذریعے ہندو بنیاد پرستی کو پھر سے بیدار کرنے کے ساتھ منسوب کرتا ہوں۔

مذہب پر عملدرآمد عبادت گاہوں تک محدود ہونا چاہیے۔ اسے لاؤڈ سپیکروں پر جلسوں اور عوامی پارکوں میں ساجنوں کے انعقاد کے ذریعے دوسروں پر مسلط نہیں کرنا چاہیے۔

جب ہمارا فرقہ وارانہ ہیجانات کے ساتھ آمنا سامنا ہوتا ہے تو ہمیں کون سے احتیاطی وتعزیری اقدامات اختیار کرنے چاہئیں؟ سب سے اہم احتیاطی تدبیر اپنی سوچ بچار کو مضبوط کرنا ہے۔ اسے ایک فرسودہ خیال تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ نہایت اہم ہے۔ ہماری سوچ بچار اتنی کمزور ہے کہ ہم اس بارے میں وقت سے پہلے کم ہی چوکنا ہوتے ہیں کہ فرقہ وارانہ ہیجانات پیدا ہو رہے ہیں اور یہ کہ ان کے تدارک کے لیے ہمیں اقدامات کرنے چاہئیں۔ ہماری دانشمندی کسی نہ کسی کو چھرا گھونپے جانے کے بعد یا پھر چند مکانات کو جلائے جانے کے بعد حرکت میں آتی ہے یا یہ کہ اخباری فرسودہ خیالی کے مطابق پولیس حرکت میں آجاتی ہے۔

ہمیں اپنی پولیس فورس کو بھی یقیناً نئے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں بس ایک اصول کو اپنا لینا چاہیے کہ اقلیتی طبقات کو ضرورت سے زیادہ نمائندگی دی جائے۔ اگر علاقہ مسلمانوں کا ہے تو پولیس کی بڑی تعداد ہندوؤں کی ہونی چاہیے اور اگر علاقہ ہندوؤں کا ہے تو پولیس کے زیادہ افراد مسلمان ہونے چاہئیں۔ ایسا کرنا ضروری ہے کیونکہ اس سے اقلیتوں میں اعتماد بحال ہوتا ہے چونکہ اقلیت میں اس بات کا خوف پایا جاتا ہے جس میں کمی لانے کی آپ کو یقیناً کوشش کرنا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے آیا واقعی سب انسپکٹر کا تعلق اقلیتی طبقوں سے ہے احتیاط کی جانی چاہیے کیونکہ یہ سب سے اہم پولیس افسران ہوتے ہیں جو کسی بھی مخصوص علاقے میں اصل صورتحال کا سامنا کرتے ہیں۔

جب ایک ہنگامہ حقیقتاً پھوٹ پڑے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ میرے پاس پیش کرنے کے لیے درج ذیل تجاویز ہیں:

سب سے پہلے جہاں کہیں بھی فساد ہوتا ہے متعلقہ انچارج پولیس آفیسر کو خودبخود معطل ہو جانا چاہیے کیونکہ قانون نافذ کرنے والے نظام کی خرابی' ادائے فرض میں کوتاہی کا واضح ثبوت ہے جبکہ یہ جاننا متعلقہ پولیس افسر کا فرض ہے کہ تناؤ بڑھ رہا تھا اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اسے اقدامات کرنا چاہئیں۔ ایک نئے پولیس افسر کو انچارج بنائے جانے کے بعد اس مخصوص علاقے کے تمام انتظامات اسے سونپ دیئے جانے چاہئیں۔ جس قدر اعتماد ہم پولیس پر کرتے ہیں ہمیں یقیناً پولیس پر اس سے زیادہ اعتماد کرنا سیکھنا ہوگا۔ یہ ان پر ہے کہ آیا ضلعی مجسٹریٹ یا جو کوئی بھی متعلقہ شخص ہے اس کے ساتھ مل کر تشدد کو روکنے کے لیے علاقے میں کرفیو نافذ کریں اور جیسے بھی اقدامات وہ کرنا چاہتے ہیں انہیں عمل میں لائیں۔

ہمیں یقیناً فتنہ پردازوں کے مقدمات کے فوری فیصلوں کے لیے بھی ضروری اقدامات کرنے چاہئیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کا ارتکاب کرنے والوں کو شاذ و نادر ہی عدالت میں لایا جاتا ہے۔ فرقہ وارانہ قاتل بہت کم ہی سزا پاتے ہیں کیونکہ ان کے خلاف گواہی دینے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا ہے۔ موقع پر ہی مقدمات کے فوری فیصلوں کی دفعات بنائی جانی چاہئیں اور مجسٹریٹ کو اختیار دیا جانا چاہیے کہ وہ پورے علاقے پر (جہاں واقعات رونما ہوئے ہیں) اجتماعی جرمانے عائد کر سکے اور ان لوگوں کو جنہیں وہ فسادات کا مجرم سمجھے سرعام کوڑے لگانے کا حکم دے سکے۔

نوکری کیسے ملتی ہے

برسوں پہلے انفارمیشن افسر کی نوکری کے لیے درخواست دینے والوں کے چناؤ کے لیے مجھے ایک بورڈ میں بیٹھنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اس وقت صرف ایک جگہ خالی تھی جسے فوری طور پر پُر کرنا نہایت ضروری تھا۔ ہم نے درخواست دینے والے چھ افراد کا انٹرویو کیا جس میں شمالی ہندوستان کی مجوزہ ذات سے تعلق رکھنے والی ایک خوبرو خاتون بھی شامل تھی۔ اس نے ایک امریکی یونیورسٹی سے گریجویشن کر رکھی تھی لہٰذا یہ فرض کیا جاسکتا تھا کہ اس کا تعلق ایک مالدار گھرانے سے تھا تاہم خوشی کی بات یہ تھی کہ ''اس دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟'' اس سے وہ بالکل بے خبر تھی۔ جیسا کہ اس نے اعتراف کیا کہ وہ اخبارات نہیں پڑھتی تھی۔ اس کے لیے آسانی پیدا کرنے کی خاطر میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ کا نام جانتی ہے۔ وہ مسکرائی اور یہ بتانے کے لیے کہ وہ نہیں جانتی اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ مزید آسانی کے لیے میں نے اس سے پوچھا کہ شیخ عبداللہ (وہ اس وقت جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ تھے) کے نام سے اس کے ذہن میں کچھ آتا ہے۔ اس نے سر کو ایک بار نفی میں ہلایا اور کہا: ''میں نے اسلامی تاریخ نہیں پڑھی ہے۔''

جب انٹرویو ختم ہو گئے تو چیئرمین نے ہم سے اس نوکری کے لیے خاتون کا نام منظور کرنے کے لیے کہا: ''ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مجوزہ ذات کے لیے ایک امیدوار کی سفارش کی جانی ہے اور ہمارے پاس صرف یہی خاتون موجود ہے۔''

انہوں نے حتمی طور پر کہا۔ جب ہماری ضرورت صرف اس خاتون کی تقرری پر انگوٹھا لگانے ہی کی تھی تو پھر ہمیں چھ امیدواروں کے انٹرویو کرنے کی مشق میں سے کیوں گزرنا پڑا تھا۔ تاہم ہم نے نہایت فرمانبرداری سے ایسا ہی کیا۔ ذرا سوچیے وہ لوگ جو اس خاتون سے معلومات حاصل کرنے آئیں گے یہ انہیں کس قسم کی معلومات پہنچانے کی اہل ہوگی۔

میں مینڈل کمیشن کی سفارشات کو تسلیم کرکے حاصل کردہ جبری نتائج کے متعلق ابھی تک ابہام کا شکار ہوں۔ جو بات واضح ہے وہ یہ ہے کہ تمام بڑی سیاسی پارٹیوں نے رپورٹ کو قبول کرلیا ہے اور نیشنل فرنٹ کی حکومت کے حامیوں کو اپنی مرضی سے قانونی منظوری حاصل کرنے پر موردالزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ مذہب' ذات اور قبیلے کے علاوہ معاشی حیثیت کو بھی زیرغور لایا جائے گا چونکہ وہ خاندان جن کی سالانہ آمدن دس ہزار روپے (اس رقم میں شاید کچھ اضافہ ہوگیا ہے) سے کم ہے انہیں وہی مراعات دی جائیں گی جو کہ محروم لوگوں کے لیے ہیں۔ یہ سب کرنے کی وجوہات صدیوں سے غیر مراعات یافتہ لوگوں اور اچھوتوں کے ساتھ ہونے والی بے انصافیوں کو روکنا ہے۔ جس بات کا ہمیں دھیان رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ ایسا کرنے کی اپنی کوششوں کے دوران کہیں ہم ذات پات کے نظام کو مستقل نہ بنادیں اور مستحق کے استحقاق کو نظرانداز نہ کردیں۔ مجھے ڈر ہے کہ مسئلے کے ان پہلوؤں پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی اور اقدامات پر عوامی ردعمل کو دھیان میں نہیں رکھا گیا تھا لہٰذا ہم خود کو ذات پات کے تضادات پر مشتمل شہری فسادات کے بیچ پاتے ہیں۔ وہ لوگ جو مقابلے کی سکت نہیں رکھتے انہیں مساوی مواقع کی فراہمی کے لیے بہترین ذرائع مہیا کرنے کی قومی ہم آہنگی کی بجائے ہم موجودہ تکلیف دہ حالات میں کسی بھی قسم کی تبدیلی لانے کی خاطر ایک مستقل مزاحمت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

نیا وزیراعظم اور میرے تحفظات

بی بی سی کی ہندی سروس نے مجھ سے نئے وزیراعظم اور ان کی کابینہ کے متعلق اظہار خیال کے لیے کہا۔ میری ہندی بہت اچھی نہیں ہے۔ میں نے ''consensus' 'Coterie `Lacklustre without political base'' کے لیے ہم پلہ ہندی الفاظ تلاش کرنے کی شدید کوشش کی اور بالآخر تجویز کردہ ہندی مترادفات کے ساتھ انگریزی الفاظ استعمال کیے۔ جنہوں نے ہمارے نئے حکمرانوں کے متعلق میرے ردعمل کا خلاصہ بخوبی بیان کیا۔

اس سیاسی صورتحال میں ہندوستان کو ایک نسبتاً جوان شخص کی ضرورت ہے جس کے پاس کرشماتی اور ماورائی ہمت ہو جو ملک کو اس دلدل سے نکال سکے جس میں یہ دھنسا ہوا ہے۔ ذاتی طور پر میں مادھوراؤ سندیا' شرد پوار یا ارجن سنگھ کا انتخاب کرتا یا پھر اگر پارٹی سے باہر کی کسی غیر متنازعہ شخصیت کو وزیراعظم کے عہدہ پر فائز کیا جاسکتا تو میرا انتخاب ڈاکٹر کرن سنگھ ہوتے۔ نرسمہا راؤ میں اپنے پیشروؤں جیسی کوئی چمک دمک نہیں ہے۔ اگر وہ ایک ایسی ٹیم کا انتخاب کرتے جو لوگوں میں اعتماد کی روح پھونک دیتی تو شاید یہ ان کے لیے ایک سرمایہ ہوتی۔ جیسا کہ ان کے چند ساتھی بغیر کسی سیاسی بنیاد کے ہیں اور اپنے آبائی شہروں میں الیکشن کے ذریعے ایک میونسپل سیٹ بھی نہیں جیت سکتے ہیں۔'' کچھ بدنام موقع پرست ہیں جو کسی بھی ایسی بس میں چھلانگ لگا سکتے ہیں جو انہیں وزارتی

عہدے تک لے جائے اور ایسے چند ایک ہی ہیں جن کی عظیم خوبی اقتدار کی نشستوں کے گرد بے کار منڈلانے کی ہو۔

تاہم صورتحال مکمل طور پر مایوس کن نہیں ہے۔ معیشت دان کے طور پر خوفناک شہرت کے حامل ایک مشہور غیر سیاسی آدمی ڈاکٹر من موہن سنگھ کی آمد نہایت خوش آئند بات ہے۔ نئے آنے والوں میں سب سے باصلاحیت چند مبرم ہیں جو آٹھویں لوک سبھا میں اپنی کارکردگی کی بنا پر ترقی کر جانے کے مستحق ہیں۔ جس بات نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا وہ ان متوازی باصلاحیت افراد کو چھوڑ دینا تھا جو وزیر اعظم کو دستیاب تھے۔ میری چھوڑ دیئے جانے والے افراد کی مرتب کردہ فہرست میں سرفہرست رام نواس مردھا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک نہایت سلجھا ہوا سیاستدان اور ناظم' شائستگی سے گفتگو کرنے والا' اپنے آپ میں مگن اور اپنی پارٹی اور ملک کے ساتھ مخلص ہے۔ نئے امیدواروں میں منی شنکر آئر بھی بہتر ہیں; عالم فاضل' ذہین و فطین ایک اچھے مقرر اور اتنے ہی باصلاحیت جتنے وہ ہوا کرتے ہیں۔ اس کا مقابلہ اپوزیشن بنچوں میں کسی سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات بھی مجھے حیران کرتی ہے کہ وزرائے اعظم حضرات' صنعتکار ممبران پارلیمنٹ جیسے کے کے برلا (K.K.Birla) کی صلاحیتوں سے بھی کچھ استفادہ حاصل نہیں کرتے ہیں جو انہیں دستیاب ہیں۔ یہ لوگ یقیناً ان لوگوں کی نسبت جو درسی کتب سے علم حاصل کرتے ہیں انڈسٹری اور کامرس کے متعلق زیادہ جانتے ہیں۔ ایسے آدمیوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایسے فیصلے نہیں کریں گے جو ان کے ذاتی خزانوں میں اضافے کا باعث ہوسکتے ہیں۔

اس بات کا میں ضرور اعتراف کرتا ہوں کہ نرسمہا راؤ کے بطور وزیر اعظم عہدہ پر فائز ہونے کے متعلق میرا ناقدانہ ردعمل درحقیقت میری توہمات سے بیزاری پر مبنی تھا۔ ایسا کوئی بھی شخص جو نیک و بد شگون سے معمولات کی تائید کرتا ہو اور ہر وقت کیسری چوغے میں ملبوس ڈھونگی چندر سوامی کی رفاقت میں رہتا ہو۔ اس سے کس طرح ملک کو اکیسویں صدی میں لے جانے کی توقع کی جاسکتی ہے؟

❖ O ❖

متھرا اور ایودھیا: دو شہر، دو کہانیاں

تشدد میڈیا کے لوگوں کے لیے بکنے والی کاپی تیار کرتا ہے جبکہ امن وامان کو قائم کیے رکھنے کی کامیابی ایسا نہیں کر پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایودھیا میں ایک مسجد کی ہونے والی بے حرمتی اور اس کے نتیجے میں مسلمان ممالک کے ساتھ ساتھ انگلستان میں بھی ہندوؤں اور سکھ مندروں کے مسمار کیے جانے نے وسیع کوریج حاصل کی تھی جبکہ متھرا میں جنم اشٹمی کو مناتے ہوئے کیا جانے والا مستقل مزاجی کا مظاہرہ جو نہایت پر امن طریقے سے گزر گیا، بہت کم توجہ حاصل کر سکتا تھا: اس بات نے یہ ضرب المثل سچ ثابت کر دی تھی کہ

"No news is good News"

جس طریقے سے متھرا میں امن قائم کیا گیا تھا اس سے بہت سے سبق حاصل کیے جانے چاہئیں۔ صورتحال تیزی سے وہی رخ اختیار کر رہی تھی جیسا کہ بابری مسجد کی تباہی کی شام کو اسے اختیار کرنے دیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے بی جے پی (BJP) کے چند محب وطن ذہنوں کے مالک اور دور اندیش رہنماؤں نے (جیسا کہ اٹل بہاری واجپائی) سوچا کہ ایودھیا کی طرز پر ایک اور تہذیب سوزی کو دی جانے والی اجازت کا انجام ملک کے لیے تباہی کا باعث بن سکتا ہے لہٰذا واجپائی صاحب لوگوں کو متھرا کے مقام پر مسجد کو نقصان پہنچانے کے منصوبوں سے پرے لے گئے تھے۔

مزید خوش قسمتی سے مایاوتی کے زیر سایہ ریاستی حکومت اور مرکزی حکومت جس

کی نمائندگی ریاستی وزیر داخلہ جناب راجیش پائلٹ کر رہے تھے انہیں صورتحال کی سنگینی کا درست وقت پر احساس ہو گیا تھا لہٰذا متھرا کو حفاظتی گھیرے میں لے لیا گیا تھا: مسجد کے گرد اس کی حفاظت کے لیے بلیک کیٹ کمانڈوز تعینات کر دیئے گئے تھے اور غنڈوں کو تنبیہ کر دی گئی تھی کہ مسجد میں داخل ہونے یا اس پر جھنڈا لہرانے کی کوشش کا جواب بندوق کی گولی سے بھی دیا جا سکتا ہے۔ بندوست کا جائزہ لینے کے لیے پائلٹ بذات خود اڑ کر متھرا جا پہنچا۔ ہندو زائرین نے ہمیشہ کی طرح اپنی عبادت کی اور محبت کرنے والے دیوتا شری کرشن کی پیدائش کی یاد منانے کے لیے وہاں ناچ گانا بھی ہوا لیکن مسلم جان و مال یا عبادت گاہوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

مایاوتی' پائلٹ اور دوسرے تمام افسران جنہوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ متھرا میں ایودھیا کو دوبارہ دہرایا نہ جا سکے وہ سب پوری قوم کے خراج تحسین کے مستحق ہیں۔

ہمیں مسلم عبادت گاہوں کو وقتاً فوقتاً ملنے والی دھمکیوں سے بچانے کے علاوہ مزید بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمیں دائیں بازو کی ہندو فرقہ پرست جماعتوں جیسا کہ بی جے پی' وی ایچ پی' شیو سینا' بجرنگ دل اور آر ایس ایس کو یقیناً قائل کرنا ہے کہ مسجدوں کی توڑ پھوڑ کو وہ اپنے ایجنڈے سے خارج کر دیں۔ اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کرتے ہیں تو یہ ہر ہندوستانی کا ملکی فریضہ ہے کہ وہ خود کو ان سبھی جماعتوں سے الگ کر لے۔

شاہی سلسلے کا آنچل

ہندوستانی سیاست ایک خاموش تمثیل اور ایک مزاحیہ پہیلی بن چکی ہے۔ ہمیں صرف اپنے سیاسی رہنماؤں کی معروفیات پر مبنی ایک کھیل تیار کرنے کے لیے خداداد صلاحیتوں کے مالک ایک ڈرامہ نگار کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ پوری قوم کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دے گا۔ شاہی خاندان کے اراکین اس تمثیل کے مرکزی کردار ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ وہی ہیں جن کے گرد ہمارے بیشتر ''نیتا'' اُن ڈوریوں سے بندھی پتلیوں کی طرح ایک پاؤں پر ناچتے ہیں جو ان کی اپنی بنائی ہوئی ہوتی ہیں۔

ان دنوں کو یاد کیجئے جب راجیو گاندھی ہندوستانی ایئر لائن میں ایک پائلٹ تھا۔ وہ ایک نجی امور میں پوری طرح غرق شخص تھا جس نے بڑی محنت سے خود کو سیاستدانوں سے دور رکھا ہوا تھا۔ پھر اس کے چھوٹے بھائی سنجے کو اپنی ماں اندرا گاندھی کی آڑ میں ایک نمایاں شخصیت کے طور پر ابھرتے ہوئے یاد کیجئے اور اس کی بیوی مانیکا جو اس کے شانہ بشانہ تیزی سے سیاسی منظر پر ترقی کر رہی تھی پھر ایک سیاہ دن سنجے نے خود کو ایک ہوائی حادثے میں ختم کر ڈالا۔ اب گاندھی کی رہائش گاہ کا منظر ڈرامائی انداز میں بدل گیا۔ پُرعزم سیاستدانوں کی لمبی قطاریں جو کہ سنجے اور مانیکا کے گھر کے باہر گھنٹوں صبر سے کھڑی رہتی تھیں اچانک راجیو سونیا اور ان کے بچوں والے رہائشی حصے کے باہر قطار باندھنے لگی تھیں۔ اپنی ماں کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے راجیو ہچکچاتے ہوئے اپنے جہاز کے کاک پٹ

سے باہر نکل آیا۔ مانیکا جو کہ سیاست میں پیش پیش تھی اسے اس کے شیر خوار بیٹے سمیت نہایت درشتی سے گھر سے باہر پھینک دیا گیا تھا کیونکہ وہ سیاسی عزائم رکھتی تھی۔ اس وقت تک راجیو کو سیاست سے گھن آتی تھی اور اس کی بیوی سونیا نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے سیاست میں حصہ لیا تو وہ اسے طلاق دے دے گی اور ہندوستان چھوڑ دے گی۔ دونوں نے اپنی سوچ کو بدل لیا۔ جب مسز گاندھی کو قتل کیا گیا تو راجیو تخت نشین ہوا۔ جب اسے عارضی طور پر معزول کیا گیا تو مانیکا شاندار طریقے سے واپس لوٹ آئی اور مرکزی حکومت میں وزیر بن گئی۔ اس کی حکومت ختم ہوئی اور راجیو پھر مرکزی اسٹیج پر واپس آ گیا جبکہ مانیکا گمنامی کی نسبت بھولے بھٹکوں کی دیکھ بھال اور تقریریں کرنے کے لیے سبکدوش ہوگئی یا کر دی گئی۔ پھر راجیو کو المناک طریقے سے منظر سے ہٹا دیا گیا۔ اب نہایت کم گو سونیا توجہ کا مرکز بن گئی' وہ ایک طرح کی راج ماتا یا اس وقت تک کے لیے شاہ کی قائم مقام ہے' جب تک اس کے بچوں میں سے کوئی ایک مرکزی اسٹیج پر جانے کی عمر کو نہیں پہنچتا۔ مانیکا اور اس کا بیٹا فیروز کسی شمار میں نہیں آتے تھے کیونکہ سنجے کی موت کے بعد مسز گاندھی نے راجیو اور سونیا کو اپنے وارثوں کی حیثیت سے آشیرباد دیا تھا لیکن مانیکا اور فیروز کا اچھا وقت ابھی شاید آنے والا ہے جب کانگریس کو اقتدار سے نکال باہر کیا جائے گا' دوسری جماعتوں کو اسی خاندان سے بڑی شخصیات کی ضرورت ہوگی' تب مانیکا اور فیروز ان کی پسند ہو سکتے ہیں۔

جب میں نے سونیا اور پریانیکا کے اپنے آبائی حلقہ انتخاب ''امیٹھی'' کے دورے کے متعلق پڑھا تو یہ کچھ میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ سونیا بہت کم بولی لیکن جو کچھ اس نے کہا وہ کانگریس کے مقتدر حلقوں کو گہری افسردگی میں مبتلا کرنے اور ارجن سنگھ تیواری کیمپ میں خوشی منانے کے لیے کافی تھا اس نے نرسمہا راؤ کے پیروکاروں کے واپس اقتدار میں واپس آنے کے امکانات کو مزید خطرے میں ڈال دیا ہے۔ کیا ہم ایک قوم کی حیثیت سے بلوغت کو پہنچ چکے ہیں؟ ہم خود کو دنیا کی عظیم ترین جمہوریت کہتے ہیں جبکہ درحقیقت ہم صرف اس تعداد میں سب سے زیادہ ہیں جو ابھی تک ایک شاہی سلسلے کے آنچل سے بندھی ہوئی کھڑی ہے۔

❖ O ❖

غلام حکمرانوں کی بے لگام آزادی

ہندوستان کے نواب گھرانوں کے متعلق میں جتنا زیادہ پڑھتا ہوں اتنا ہی زیادہ قائل ہوتا چلا جاتا ہوں کہ دنیا نے طفیلیوں کی اس سے زیادہ عیاش اور بے کار قسم نہیں دیکھی ہوگی۔ تیل کی دولت سے مالا مال عرب شیوخ فضول خرچی میں ان کی پیروی کرر ہے ہیں۔ اسی طرح ہمارے کچھ نو دولتیے اور سیاست دان ہیں جو عوام کے پیسوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں جسے ترنگ میں ضائع کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے نوابوں کے ہاتھوں ریاستی خزانوں کی لوٹ کھسوٹ اور خودسرانہ' فضول اور مجرمانہ شاہ خرچیاں داستانوں کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ حیدرآباد کے آخری نظام سے ہی شروع کرلیں' اگر چہ وہ سادہ کرتہ پاجامہ اور اپنے سر پر ایک شکن آلود ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے لیکن پیپر ویٹ کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ان کے پاس جیکب ہیرا موجود تھا یعنی ''چمکتے ہوئے اور بیش قیمت 280 قیراط کے لیموں کی جسامت کا ایک پتھر۔'' سرکنڈوں اور خودرو جھاڑیوں سے بھرے ہوئے باغ میں ایک درجن ٹرکوں کا ایک تجارتی قافلہ لدے ہوئے بوجھ کی وجہ سے دھروں تک کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا اور یہ بوجھ سونے کی اینٹوں کی شکل میں تھا۔ نظام کے پاس قیمتی پتھروں کا اتنا عظیم ذخیرہ تھا کہ یہ کہا جاتا تھا کہ پکاڈلی سرکس کے فٹ پاتھوں کو ڈھانپنے کے لیے صرف وہ موتی ہی کافی تھے جو اس کے تہہ خانوں میں اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے کوئلوں کی کان میں کوئلے بکھرے پڑے

ہوں۔ جبکہ نیلم، زمرد، روبی اور دیگر کئی اقسام کے ہیرے زر و جواہر کی ڈھیروں میں جابجا گڈمڈ ہوئے دیکھے جاسکتے تھے۔ اس کے پاس بیس لاکھ سے زائد پاؤنڈ نقد موجود تھے جبکہ پرانے اخبارات میں لپٹے ہوئے ہیرے محل کے گرد آلودتہ خانوں اور بالاخانوں کے کونوں کھدروں میں ٹھنسے ہوئے تھے۔ وہ چوہوں کے جبڑوں سے ایک قسم کا منفی سود کماتے تھے جو ہر سال نظام کے خزانے میں موجود ہزاروں پاؤنڈ کترکراپنا راستہ بناتے تھے۔

میسور کے مہاراجا کے پاس چھ سو کمروں پر مشتمل ایک محل تھا۔ وہ اپنی مردانہ قوت کے متعلق بھی پریشان تھا۔ ایک عطائی کے کہنے پر وہ پسے ہوئے ہیروں کی خوراک لیتا تھا اور اس کی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے والی خواتین کی اکثر سونے اور ہیروں کے زیورات سے آراستہ ہاتھیوں پر بٹھا کر نمائش کی جاتی تھی۔ بُرودہ کے مہاراجا اپنے پسندیدہ ہاتھی کو سونے کی زنجیروں سے جوتتے تھے جن کی مالیت کا تخمینہ پچیس ہزار پاؤنڈ ہے۔ وہ دنیا کے ساتویں سب سے بڑے ہیرے "Star of the south" کے مالک ہونے کی بھی شیخی بگھارا کرتے تھے۔ پٹیالہ کے مہاراجا کے پاس ستائیس رولز رائس تھیں جبکہ بھرت پور کی رولز مہاراجا کی ذاتی خواہش پر بنائی گئی تھی اور اس پر چاندی کا پانی چڑھایا گیا تھا۔ جونا گڑھ کے نواب نے اپنی پسندیدہ کتیا کی شادی کے لیے تمام رسوم کا اہتمام کیا تھا۔

چھوٹی ریاستوں میں سے ایک کپورتھلہ کے مہاراجا اپنے گلے میں موتیوں اور ہیروں کو پہننے کے ساتھ ساتھ اپنی پگڑی میں دنیا کا سب سے بڑا پکھراج سجایا کرتے تھے۔ جے پور کے مہاراجا نے اپنے بیش قیمت پتھروں کا ذخیرہ اپنے قلعوں کی دیواروں تلے دفنایا ہوا تھا۔ یہ حضرات برطانویوں کی شفیق سرپرستی کے تحت یہ سب کچھ کر سکتے تھے جنہوں نے انہیں ایسے بگڑے ہوئے بچے تصور کیا جن کے پاس بہت زیادہ کھلونے تھے۔ اس کے بدلے میں نواب برطانوی شاہی خاندان کے ساتھ اپنی دائمی وفاداری کا پرزور اعلان کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ جناب عزت مآب نظام حیدر آباد پرشکوہ خطابات پر اتراتے تھے جو کہ ان کی نمائشی عظمت کے شایان شان تھے۔ مثال کے طور پر حیدر آباد کے ساتویں نظام رستم دوراں، ارسطوئے زماں والمالک، آصف جاہ، نواب میر عثمان علی خان بہادر، مظفر الملک، نظام الملک، سپاہ سالار فتح

جنگ' عزت مآب برطانویوں کے سب سے زیادہ وفادار حلیف تھے۔

ظاہر ہے کہ بے انتہا دولت' اس کی نمائش کے شوق اور حماقت کے درمیان ایک تعلق پایا جاتا ہے۔ چند سال پہلے ایک سندھی NRI باراتیوں کو جہاز میں لاد کر لندن سے بمبئی لایا۔ آنے والوں میں دولہے کا ذاتی ہیر ڈریسر بھی شامل تھا۔ تاج محل ہوٹل میں ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ فرانسیسی شیمپین کی بوتلوں اور اعلیٰ نسل کی سرخ شراب کے ساتھ کیویئر (نایاب و مہنگی مچھلی) اور اسی قسم کی دوسری نفیس ڈشیں پیش کی گئیں۔ یہ ان کا روپیہ تھا اور انہیں مکمل اختیار تھا کہ وہ اسے جیسے چاہتے برباد کرتے۔ انہیں یہ کبھی احساس نہیں ہوا کہ یہی روپیہ دس کروڑ مفلس خاندانوں کو ایک دہائی یا اس سے زیادہ عرصہ تک خوراک مہیا کرنے کے کام آ سکتا تھا۔

جس بات نے مجھے مزید خوفزدہ کیا وہ یہ تھی کہ جے للیتا جیسی نفیس اور پڑھی لکھی عورت اتنی غیر محتاط ہو سکتی ہے کہ اپنے لے پالک بیٹے کی شادی کی تقریب پر کروڑوں روپیہ ضائع کر دے۔ ہماری اخلاقی ذمہ داری یہ یاد رکھنا ہے کہ وہ روپیہ جو آپ کو کچھ آسودگی فراہم کرے قابل برداشت ہوتا ہے جبکہ اس کی زیادتی جلاب کی طرح کام کرتی ہے۔

بھارتی قائدین: خس کے پُتلے

شخصیات یا اقوام کے جنم دن جادوئی اہمیت کے حامل ہرگز نہیں ہیں تاوقتیکہ ہم انہیں یہ سمجھ کر مناتے رہیں کہ وہ واقعی انتہائی اہم ہیں۔ سال گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان بوڑھے ہوتے جاتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے' سمجھدار یا شاید ذہین تر ہو جاتے ہیں اور پچاس کے بعد جسمانی اور ذہنی طور پر زوال پذیر ہونے لگتے ہیں۔ قوموں کو فقط زیادہ سے زیادہ سمجھدار ہونا چاہیے۔ ماضی کی غلطیوں سے سیکھنا چاہیے اور آنے والی نسلوں کے لیے دانشمندی کا ورثہ چھوڑ دینا چاہیے۔ اس سال ہم بحیثیت ایک آزاد قوم کے پچاس برس کے ہو گئے ہیں۔ سالگرہ کی اس تقریب کو بڑے پیمانے پر منانے کے لیے تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو پروگراموں' سیمیناروں' پریڈوں اور ریاستی تقریبات کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ فارن میڈیا بھی اپنے ناظرین اور پڑھنے والوں کو بتانے کے لیے اُتنا ہی بے تاب ہے کہ آزادی کے بعد کا نصف ہندوستان کیا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے ایک درجن سے زائد امریکی اور یورپی ٹی وی کی ٹیموں نے یہ ریکارڈ کروانے کے لیے کہ میں 82 سال کی عمر میں اپنے ملک کے بارے میں کیسا محسوس کرتا ہوں' سائن کر رکھا ہے۔ ایک ٹیم مجھے پاکستان میں اس گاؤں جہاں میں پیدا ہوا تھا' اور لاہور جہاں میں نے گریجوایشن اور بعد میں تقسیم کے وقت تک پریکٹس کی تھی' لے جانے کا منصوبہ رکھتی ہے۔ میں انہیں کیا بتاؤں؟ ملک کے تقسیم ہونے پر ہونے والی مایوسی؟ آزادی کے پہلے چند سالوں کی گرمجوشی؟ اندرا گاندھی کے دورِ حکومت کے آغاز پر ٹوٹنے والا طلسم اور دور رس ہونے والے داہے اور آج تک جاری گلنے سڑنے کا عمل؟

میں ونسٹن چرچل کے الفاظ میں پوشیدہ سخت توہین کو یاد کرتا ہوں جس نے لیبر پارٹی کے ہندوستان کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرنے کے وعدے کی مستقل مزاجی سے مخالفت کی تھی۔ ہماری آزادی سے چند روز پہلے اس نے کہا:

> ''اقتدار بدمعاشوں' رہزنوں اور لٹیروں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔ پانی کی ایک بھی بوتل یا روٹی کا ایک بھی ٹکڑا ٹیکس سے بچ نہیں سکے گا۔ صرف ہوا مفت ملے گی اور ان لاکھوں بھوکے لوگوں کا خون وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی کے سر ہوگا۔ یہ خس کے بنے انسان ہیں' جن کا چند سالوں بعد کوئی سراغ بھی نہیں ملے گا۔ یہ آپس میں لڑیں گے اور ہندوستان فضول سیاسی جھگڑوں میں گم ہو جائے گا۔''

یہ پرلے درجے کی بیہودگی تھی۔ گاندھی' نہرو' پٹیل' آزاد اور پنت تنکوں سے بنے آدمی نہیں تھے۔ ان واضح خیالات کے ساتھ کہ وہ ہندوستان کے ساتھ کیا کر سکتے تھے وہ سیاسی فراست کے حامل لوگ تھے۔ وہ اسے برطانوی طرز کے آئین کے ساتھ ایک سیکولر جمہوریت بنا سکتے تھے۔ انہوں نے خواتین کو مردوں کی طرح روزگار' وراثت' شادی اور طلاق کے معاملات میں برابری کے حقوق فراہم کیے' انہوں نے اچھوت پیدا کرنے والے معاشرتی نظام کو قانون کی حمایت سے محروم کیا' انہوں نے ملک کو خوراک اور اشیائے صرف کے ضمن میں خود کفیل بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی' انہوں نے عدلیہ کی خود مختاری میں تحریف نہ کرنے کے لیے کافی احتیاط سے کام لیا' انہوں نے پریس کو اظہار خیال کی آزادی کا یقین دلایا اور مسلح افواج کو سیاست سے دور رکھا تھا۔ زوال اندرا گاندھی کے وقت شروع ہوا۔ اس کے بعد ہمارے تمام چوٹی کے رہنما درحقیقت ''تنکوں کے بنے آدمی' بدمعاش' لٹیرے اور رہزن تھے۔'' وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے اور ہندوستان بظاہر فضول سیاسی جھگڑوں میں کھو گیا۔

حکومت خود اختیاری کے پچاس سالہ دردناک خواب کا اس سے موزوں انجام کیا ہو سکتا ہے کہ ایک ختم ہونے والی وزارت کی مرکزی کابینہ کے انیس اراکین کو بدعنوانی کے الزامات کے ضمن میں زبردستی استعفیٰ دینے کے لیے کہا جائے اور ان کے سربراہ' سابق وزیراعظم پر دفعہ چار سو بیس کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔

❖ ○ ❖

ووٹ کا حقدار کون؟ ایک المناک مخمصہ

ہمارے سیاسی رہنماؤں نے ہم پر ایک اور عام انتخابات مسلط کر دیے ہیں۔ ہمیں ایسی کوئی تمنا نہیں تھی کیونکہ ہم ہر دوسرے سال انتخابات کروانے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم میں سے زیادہ تر لوگ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں اور خود کو ذہنی طور پر تیار ہی نہیں کر سکتے کہ ووٹ کس کو دیں۔ رہ گئی پسند کی بات تو ہم اسے پسند کر سکتے ہیں جس کا تعلق ایسی پارٹی سے ہو جو واضح اکثریت سے جیتے گی اور ملک کو ایک مستحکم حکومت فراہم کرے گی۔ ذاتی طور پر میری یہ رائے ہے کہ ہمیں صدارتی طرز حکومت کا انتخاب کرنا چاہیے اور اس طرح بار بار کے الیکشنوں کے تکلیف دہ عمل سے بچنا چاہیے۔ تاہم اس دفعہ ہمیں اپنے حالیہ نظام کو ہر صورت میں بہتر بنانا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہمارے پاس آنے والے صرف چار ماہ ہی بچے ہیں۔

پہلا سوال جو ہمیں خود سے کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ وزیر اعظم کون بنے گا۔ علامہ اقبال نے تین اوصاف بیان کیے ہیں جو ایک میر کارواں میں ہونے چاہئیں: نگاہ بلند' سخن دلنواز اور جاں پُرسوز۔ میں ان مرد و خواتین کی ایک فہرست تیار کر سکتا ہوں جن میں یہ تینوں خوبیاں مختلف مقدار میں موجود ہیں جیسا کہ جیوتی باسو' من موہن سنگھ' ارجن سنگھ' سونیا گاندھی' سنگما' شرد پوار' ممتا بینرجی' ڈگ وجے سنگھ' مادھوراؤ سندیا' جارج فرینڈس' راجیش پائلٹ' شیلا ڈکشت اور شائد کچھ اور لوگ۔ اگر موقعہ دیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ان

میں سے کوئی بھی ایک اچھا وزیراعظم بن سکتا ہے۔

مگر بغیر کسی شک وشبہ کے میرے ہم وطن خواتین وحضرات اس بات سے اتفاق کریں گے کہ بہ نسبت کسی اور امیدوار کے اٹل بہاری واجپائی زیادہ بہتر صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ وہ وسیع النظر ہیں اور ملک میں پائے جانے والے مقررین میں سے بدرجہا بہتر ہیں اور خود پسندی سے بے نیاز ایک نہایت ملنسار آدمی ہیں۔ ان کو حکومت کرنے کا مناسب موقع نہیں دیا گیا تھا؛ پہلی مرتبہ تیرہ دن' دوسری مرتبہ تیرہ ماہ لیکن وہ بھی اُن اتحادیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے' جو اکثر و بیشتر دشمنوں کی طرح پیش آتے ہیں۔ سیماب اکبرآبادی کے مصرعے ذہن میں آتے ہیں:

''پھر میں آیا ہوں تمہارے پاس' میر کارواں
چھوڑ آیا تھا جہاں تو' وہ میری منزل نہ تھی!''

واجپائی کو ایک مرتبہ پھر برسراقتدار دیکھنے سے زیادہ میرے لیے خوشی کی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ لیکن اور یہ بہت بڑی ''لیکن'' ہے...... شرط یہ ہے کہ وہ اپنے عقب بین مشیروں سے جان چھڑوا لیں جن کے سر پر مندروں' مسجدوں' چرچ اور گردواروں کے بے معنی جھگڑے مسلط رہتے ہیں۔ انہیں بے کار لوگوں سے چھٹکارا پالینا چاہیے اور وشوا ہندو پریشد' آر ایس ایس' شیوسینا اور بجرنگ دل کے ہندو بنیاد پرستوں کے کہنے پر یقیناً عمل نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں مسلم لیگ اور اکالی دل جیسی جماعتوں کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ یہ جان کر کہ وہ ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کے لیے کس قدر قابل قبول ہیں' انہیں حیرت نہیں بلکہ خوشگوار حیرت ہوگی۔

مجھے احساس ہے کہ میں نہایت غیر حقیقت پسند ہوں۔ امید کے برخلاف امید رکھنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ وہ لوگ جنہیں میں ناپسندیدہ سمجھتا ہوں وہ الیکشنوں میں شکست سے دوچار ہوں گے۔ مہان بھارت ورش کا خواب دیکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

❖ ○ ❖

دوسرا حصہ

واقعات وحوادث

کاماگاٹامارُو کی کتھا

مجھے ایک نوجوان نے اپنی معلومات عامہ کا امتحان لینے کے لیے کہا جو اپنے جنرل نالج کے پرچے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے UNICEF' UNO' MCC وغیرہ جیسے مخفف الفاظ کا کیا مطلب ہوتا ہے اور دارالخلافوں اور ریاستی صدور کے ناموں کو رٹا لگا رکھا تھا۔ میں نے اسے حالیہ تاریخ کے واقعات پر آزمایا۔ ''کاماگاٹامارُو (Komagata Maru) کیا تھا اور کب ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کاماگتا؟'' اس نے ٹپٹاتے ہوئے پوچھا: ''اس کے متعلق کبھی نہیں سنا' میں نے جنرل نالج کی جو کتاب رٹی ہوئی ہے یہ اُس میں نہیں ہے۔''

نئی نسل کے زیادہ تر لوگوں کا شائد یہی ردعمل ہو سکتا تھا۔ انہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہ نام اور اس سے وابستہ سلسلۂ واقعات ہماری آزادی کی تحریک کا ایک اہم سنگ میل تھا اور یہ کہ "The Komagata Maru Incident" کے نام سے ایک ڈرامہ اس وقت انگلستان کے بڑے شہروں کا دورہ کر رہا ہے۔ اسے شیرون پولاک (Sharon Pollock) نے لکھا اور جیریکو تھیٹریکل پروڈکشنز نے تیار کیا ہے۔ اگرچہ مرکزی خیال تقریباً سارے کا سارا ہندوستانی ہے لیکن ہدایت کار اور زیادہ تر کاسٹ کا تعلق انگلستان' کینیڈا یا کیریبئین (Caribbean) سے ہے۔ اداکاروں میں صرف دو ہندوستانی' راشد کاراپیٹ (Rashid Karapiet) ؛ جو کبھی آل انڈیا

ریڈیو پر اناؤنسر تھے اور شاعر ریجینالڈ میسی (Reginald Massey) کی بیوی جمیلہ میسی شامل ہیں:

انہوں نے اس واقع کو جو کہ 70 سال پہلے وقوع پذیر ہوا تھا اس لیے چنا ہے کیونکہ یہ نسلی تعصب کی ایک ابتدائی مثال تھا اور اس کا آج تک یورپی نسلوں کی طرف سے سیاہ فاموں کے ساتھ اختیار کیے جانے والے رویے سے گہرا تعلق ہے۔

اس میں وینکوور (Vancouver, Canada) کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ 1916ء کی گرمیوں کا زمانہ ہے۔ چند ہزار ہندوستانی مہاجرین جن میں سے بیشتر ریٹائرڈ سکھ فوجی ہیں انہیں لکڑی کاٹنے کے کارخانوں میں نوکری مل گئی ہے اس چھوٹے سے گروہ کی ایک وسیع اور غیر آباد ملک میں صرف موجودگی نے یورپی نسل کے کینیڈا کے باشندوں کے ذہن میں حقارت پیدا کر دی ہے۔ ایک مشہور گیت کا عنوان ہے:

"White Canada Forever"

اس گیت کے بول کچھ یوں ہیں:

''ہم آج بھی سفید رنگت والوں کو بھائیوں کی طرح خوش آمدید کہتے ہیں۔\
لیکن عیار میلی رنگت والوں کو\
جن کے قول جھوٹے ہیں اور جو کمزور کی حق تلفی کرتے ہیں'\
انہیں رہنے کے لیے لازماً کوئی اور جگہ ڈھونڈنا ہوگی\
مشرقی باشندوں کی گرفت اور لالچ کے سامنے\
ہم جھک جائیں گے' نہیں! ہرگز نہیں!\
ہمارا نعرہ ہے!\
خدا شاہ کی حفاظت کرے\
سفید فام کینیڈا ہمیشہ رہے۔

ٹھیک 71 سال پہلے مئی کے مہینے میں ایک جاپانی جہاز ''کاما گاٹا مارو'' جسے امرتسر کے نواحی گاؤں سرہالی کے گردت سنگھ نے کرائے پر لے رکھا تھا' کینیڈا میں بسنے کی نیت سے آنے والے 376 ہندوستانیوں سمیت وینکوور پہنچا۔ برٹش کولمبیا کے وزیراعظم'

سر رچرڈ میک برڈ نے انہیں ساحل پر اترنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: ''اتنی بڑی تعداد میں مشرقی باشندوں کو داخل کرنے کا انجام سفید فام لوگوں کا ناپید ہو جانا ہوسکتا ہے اور ہم نے اس ملک کو سفید فام لوگوں کا ملک بنائے رکھنے کی ضرورت کو ہمیشہ ذہن میں رکھا ہے۔''

جہاز دو ماہ تک وینکوور کی بندرگاہ پر لنگر انداز رہا' یہاں تک کہ پھر اسے کینیڈا کی مسلح کشتیوں نے زبردستی باہر نکال دیا۔ جب جہاز کلکتہ کے نزدیک بج بج (Budge Budge) گھاٹ پر پہنچا تو ہندوستانی پولیس نے اس کے مسافروں کو زبردستی ریل گاڑیوں میں دھکیلنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً ایک ہلڑ مچ گیا؛ پولیس نے فائر کھول دیا جس کے نتیجے میں 18 افراد جاں بحق اور 25 زخمی ہوئے۔

چند سال پہلے اس موضوع پر بننے والی ہندی فلم فلاپ ثابت ہوئی تھی' اب وہی واقعہ ایک کامیاب کھیل کی صورت میں سامنے آیا ہے' لہٰذا کسی باہمت تنظیم کو اسے ہندوستان لا کر عوام کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

ذکر ایک متنازعہ خط کا

پارلیمنٹ کے رکن اور کالم نگار ہونے کا ایک فائدہ ان خیالات کا اظہار کرنا ہے جنہیں پریذائیڈنگ آفیسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کینیڈا کے وزیر اعظم برائن ملرونی کی جانب سے راجیو گاندھی کو لکھے جانے والے ایک ذاتی خط کی طرف میں نے قابل ذکر توجہ دلائی تھی، جسے ملرونی نے کینیڈا کے اخبارات کو جاری کیا تھا۔ ایک مشتعل ہندوستانی' کے۔صابر نے مجھے ایک تراشہ بھی ارسال کیا تھا۔ اس کے خیال میں اس خط کی ٹورنٹو کے گلوب اینڈ میل (Globe&Mail) میں اشاعت سفارتی آداب کی خلاف ورزی تھی کیونکہ اس خط کا تعلق ہندوستان اور کینیڈا کے ہوائی اڈوں پر کیے جانے والے حفاظتی اقدامات سے بھی تھا اور پھر اس میں اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز کرتے ہوئے ہمارے وزیر اعظم کو ان معاملات پر دکھتی ہوئی نصیحت کرنا بھی شامل تھا جن کا تعلق سراسر صرف ان ہی سے تھا لہٰذا میں نے اس مسئلے کو پارلیمنٹ میں زیر بحث لائے جانے کا مستحق سمجھا لیکن نائب صدر آر وینکٹ رامن جو راجیہ سبھا کی صدارت کرتے تھے اس بات سے متفق نہیں تھے۔ وہ ان کا فیصلہ تھا اور یہ میرا فیصلہ ہے۔

یہ شاید عوام کو یاد ہو کہ ایئر انڈیا کی پرواز جو 329 مسافروں سمیت سمندر میں ڈوب گئی تھی اور کینیڈین پیسفک کا جہاز جو تباہی سے بال بال بچا تھا' کینیڈا ہی سے اڑا تھا۔ کینیڈا کے تین ہوائی اڈوں ٹورنٹو' مانٹریال یا وینکوور میں سے کسی ایک پر ان میں دھماکہ خیز مواد نصب کیا گیا تھا۔ کینیڈا' ہندوستانی انتہا پسندوں کا اعصابی مرکز ہے جہاں سے وہ پنجاب میں موجود اپنے

ساتھیوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ زیادہ تر کینیڈا ہی میں خالصتانی سفارت خانوں' پاسپورٹوں اور کرنسی جیسا مسخرہ پن پایا جاتا ہے اور جہاں خبط عظمت میں مبتلا جگجیت سنگھ چوہان اکثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہوائی حادثے کے بعد کی بات ہے کہ راجیو گاندھی نے بالکل بے ضرر بیان جاری کیا ہے کہ کینیڈا کی حکومت ''دہشت گردوں کے ساتھ پہلے تو اتنی سخت گیر نہیں تھی'' اور ٹائمز آف انڈیا نے اسے ''اس سے کم غفلت برتی نہیں جا سکتی تھی'' کے پیرائے میں بیان کیا تھا۔

برائن ملرونی (Brain Mulroney) نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ کینیڈا کے رہنے والوں کو تشویش تھی۔ ان کے ہوائی اڈے کے انتظامات ''کم از کم اتنے سخت ضرور تھے جتنا کہ مثال کے طور پر بمبئی اور کلکتہ میں ہوائی اڈوں پر ہوتے ہیں۔'' اس نے نہایت وثوق سے کہا تھا: ''اپنے جمہوری معاشرے کی حدود میں رہتے ہوئے راجیو کو ان سے مزید کیا کرنے کی توقع تھی؟'' اس نے اس سوال پر اس فقرے کا اضافہ بھی کیا: ''تعمیری رائے کی بجائے اس ملک کی کوششوں کی تضحیک کینیڈا کے بیشتر باشندوں کو خواہ مخواہ کی بے عزتی بھی محسوس ہو سکتی ہے۔'' کینیڈا کے وزیراعظم مزید لکھتے ہیں: ''میں باہمی الزامات اور ہندوستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے بچنا چاہتا ہوں۔ تاہم کینیڈا کی سرزمین پر لگائے جانے والے دہشت گردی کے پودے کی جڑیں واضح طور پر پنجاب کے غیر حل شدہ اور کشیدہ سیاسی تنازعات میں پائی جاتی ہیں۔'' قصہ مختصر اس نے راجیو کو کینیڈا پر الزامات لگانے سے پہلے اپنے گھر کو منظم کرنے کے لیے کہا ہے۔

اس سلسلے میں تین سوالوں کے جوابات دیئے جانے کی ضرورت ہے۔ پہلا سفارتی آداب کے متعلق ہے۔ کینیڈا کے وزیراعظم نے اپنے ذاتی رابطے کو اخبارات میں شائع کیوں کروایا؟ کیا دونوں ممالک کے درمیان سفارتی ذرائع ناکارہ ثابت ہوئے ہیں؟ دوسرا' جن دو افراد کے نام ممکنہ مجرموں کے طور پر لیے جا رہے ہیں انہیں گرفتار کرنے کے لیے کینیڈا کے اعلیٰ حکام نے اب تک کیا کیا ہے؟ کینیڈا کی پولیس جو مطلوبہ آدمیوں کو ہمیشہ پکڑ لینے کی شیخی بگھارتی ہے انہیں ابھی تک ان دو بدمعاشوں کا کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے اور اب جبکہ راجیو نے درحقیقت اپنے گھر کو ٹھیک کر لیا ہے تو کینیڈا کے اعلیٰ حکام چوہان اور اس جیسے لوگوں کو سکھوں اور ہندوستان کے خلاف تشدد آمیز جنگ کو جاری رکھنے سے روکنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟

آبی مذہبی تہوار اور مقدس ڈبکیاں

اگر چہ ہندو مذہب کی رسومات آگ اور روشنی جیسے عناصر کی عبادت کا حکم دیتی ہیں تاہم دراصل یہ پانی ہی ہے جس نے ممتاز تر مقام تقدیس حاصل کیا ہے۔ تیرتھ دراصل دریا کا ایک کنارہ ہے اور تیرتھ استھان (زیارت کی جگہ) اس کے نواح میں واقع ہے۔ ہم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ گنگا یا گوداوری جیسے کچھ دریاؤں کو کب اور کیوں دوسرے دریاؤں کی نسبت زیادہ مقدس سمجھا جانے لگا تھا لیکن ''مقدس ڈبکی'' کی رسم پرانوں کے دور ہی سے مروج تھی۔ اناج سے بھرے برتنوں (کمبھوں) کو دریا میں ڈبونا اور بیج بونا اس لیے مقدس قرار دیے گئے تھے کیونکہ آدیواسیوں کے ہاں اسے زرخیزی کی رسم سمجھا جاتا تھا۔ پرانوں نے ''امرت ملتھن'' میں اس رسم کی دیومالائی وضاحت کچھ اس طرح کی ہے کہ جب دیوتاؤں اور بدروحوں نے مل کر سمندر کے پانیوں کو بلویا تو اس عمل سے حاصل کیے جانے والے ''امرت کا برتن'' بدروحوں نے چرا لیا اور جونہی اسے لے کر وہ اپنے تعاقب میں آنے والے دیوتاؤں سے بچنے کے لیے فرار ہوئے تو چوری شدہ امرت کے قطرے ہردوار' الہ آباد' اجین اور ناسک کے مقام پر گرے۔ بدروحوں نے پکڑ سے بچنے کے لیے یقیناً نہایت بل کھاتا ہوا راستہ اختیار کیا تھا۔

گوتم بدھ نے سال کے مخصوص دنوں میں گنگا کے کنارے ہندو زائرین کے اجتماعات کی نشاندہی کی ہے' چوتھی عیسوی کا چینی سیاح ہیون سانگ بھی شہنشاہ ہارش کی

طرف سے گنگا اشنان کے لیے آنے والے زائرین کو خیرات دینے کے واقعات کو قلمبند کرتا ہے لیکن کمبھ میلوں کے تین' چھ اور بارہ سالوں پر مشتمل سلسلے اس وقت تک مستحکم بنیادوں پر استوار نہیں ہوئے تھے جب تک سنکار نے ہندومت کی ازسرنوتشکیل کے لیے نہانے کی رسم کو اپنی تجدیدی جدوجہد کے باقاعدہ حصے کے طور پر رائج نہیں کر دیا تھا۔ مبارک ترین کمبھ بارہ سالوں میں ایک مرتبہ آتا ہے جب سورج بُرج حمل کے مدار میں اور مشتری بُرج دلو میں بیک وقت داخل ہوتے ہیں۔

ڈی۔کے۔رائے اور اندرادیوی نے اپنی کتاب

"Kombha:India,s Ageless Festival(1985)" میں

ان میلوں میں ہونے والے واقعات کی سرگزشت بیان کی ہے جو ہر قسم کی خوشامد سے پاک ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ یہاں لاکھوں کی تعداد میں مجمعے لگتے تھے' گروہی تصادم ہوتے تھے جن کا نتیجہ بہت سی جانوں کے ضیاع کی صورت میں نکلتا تھا' بہت سے غیر معروف المیوں میں سے ایک 1760ء عیسوی میں ہردوار کے مقام پر گوسینوں اور بیراگیوں کے درمیان مکمل تیاری سے لڑی جانے والی جنگ تھی جس میں اٹھارہ ہزار آدمی مارے گئے تھے۔ایک اور جھگڑے میں اسی جگہ 1975 میں سکھ زائرین نے 500 گوسینوں کو تہ تیغ کر ڈالا تھا' سینکڑوں ڈبو دیئے گئے تھے یا بھگدڑ کے دوران پیروں تلے کچل دیئے گئے تھے۔ہزاروں لوگ وباؤں کا شکار ہو گئے تھے جبکہ خواتین کو یرغمال بنانے کے بعد ان کی آبروریزی کی گئی تھی اور بچوں کو اغوا کر لیا گیا تھا۔راکھ میں لتھڑے ہوئے ناگا سادھوؤں کے جلوس بانجھ خواتین کے جنسی جذبات کی مضطربانہ نمائش کا باعث بنتے تھے جو درحقیقت ایک زندہ شیولنگ کی پوجا کو اس کی علامتی پوجا کی نسبت زیادہ مفید سمجھتی تھیں۔تاہم کمبھ میلوں کا وجود ان تمام المیہ واقعات کے باوجود باقی رہا کیوں کہ مبارک گھڑی کے دوران گنگا میں لگائی گئی ایک ڈبکی یاتری کو آباءواجداد کے 88 نسلوں سے جمع شدہ گناہوں سے پاک کر دیتی ہے۔

❖ O ❖

سنہری معبد کی سیاہ تاریخ

اس سال گولڈن ٹیمپل (ہرمندر صاحب) کے قیام کی چار سوویں سالانہ تقریب ہے۔ یہ بات مشکوک نظر آتی ہے کہ آیا امرتسر میں اس موقع کو اس کے شایان شان منایا جائے گا انتظامی تنظیم میں جاری تو' تو' میں' میں کے ساتھ شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی (SGPG) اور خوف کی فضا جو بلیو سٹار اور بلیک تھنڈر کے بعد ابھی تک پھیلی ہوئی ہے' اس کے پیش نظر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ کوئی شاندار پروگرام دیکھنے کو ملے۔ اس بات کا کافی امکان ہے کہ اکالی رہنما جو کوئی تعمیری کام کرنے پر یقین نہیں رکھتے ہیں لیکن ہمیشہ سے شکایتیں گھڑتے رہتے ہیں ایک مرتبہ پھر انتظامیہ کے سر پر ٹیمپل کو لوٹنے کا الزام لگائیں گے اور اپنا احتجاج بلند کرنے کے لیے تمام تقریبات منسوخ کر دیں گے۔

گولڈن ٹیمپل کی تاریخ ہنگاموں سے بھرپور ہے۔ مسلمان صوفی حضرت میاں میرؒ کے ہاتھوں اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے وقت سے ہی مہنت نے اسے روپے سے محروم کرتے چلے آئے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی جیسے حملہ آوروں کے ہاتھوں اس کی تقدیس پامال ہوئی ہے اور مسا رنگھڑ جیسے بدتہذیب لوگوں نے اس کا غلط استعمال کیا ہے حتیٰ کہ مہاراجا رنجیت سنگھ کے ہاتھوں سنگ مرمر اور طلائی پتروں سے ہونے والی اس کی دوبارہ تعمیر کے بعد بھی خاندانی گرنتھیوں اور مذہبی پیشواؤں نے اسے اپنے خاندان کی جائیداد سمجھ کر اس سے بھرپور ناجائز فائدہ حاصل کیا۔ یہ گولڈن ٹیمپل ہی تھا کہ جہاں

جلیانوالہ قتل عام کے مرتکب جنرل ڈائریکٹر کو سر اَرُور سنگھ نے سروپا (Robe of honour) پیش کیا تھا۔ جرنیل سنگھ بھنڈراں والا کے ہاتھوں ٹیمپل کی پامالی جس نے اس کے بعض حصوں کو فوجی قلعہ میں تبدیل کیا تھا اور اس کے بانی گروارجن کی برسی کے موقع پر ہندوستانی فوج کا اکال تخت کو تباہ کرنا اس کی تاریخ کی ایک اور المناک کڑی تھی۔

قومی شخصیات اور سالانہ تقریبات

ایک قوم کی حیثیت سے ہم بوریت کو برداشت کرنے کی لامحدود گنجائش رکھتے ہیں۔

اس سال ہم ڈاکٹر رادھا کرشنن، مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی سالانہ تقریبات (پیدائش کی یا موت کی، میں یقین سے نہیں بتا سکتا ہوں) مناتے ہیں۔ لہٰذا ٹی وی اور ریڈیو پر دکھانے کیلئے ہمارے پاس ان صاحبان کی حیات وخدمات پر مبنی سیریلز موجود ہیں۔ ہر اخبار اور جریدے کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ اگر اس نے ان لوگوں پر ضمیمے شائع نہ کیے تو کسی چیز کی کمی رہ جائے گی۔ ہر یونیورسٹی لازماً مباحثوں کا انتظام کرتی ہے اور ہندوستان کے ان عظیم سپوتوں کے کارہائے نمایاں پر عالمانہ خطبات دیئے جاتے ہیں۔ ہم کبھی بھی نئی چیز نہیں سیکھتے ہیں۔ ہم مسلسل ایک ہی طرز کے بے معنی الفاظ سنتے رہتے ہیں۔ بے خوابی کا بہترین علاج یہ ہے کہ پنڈت نہرو پر ہونے والے مباحثے میں شرکت کی جائے کیونکہ یہ نیند کی چار گولیوں سے بہتر ہے۔

بظاہر بے کیف قسم کی دھواں دھار تقریریں ہمارے جینز میں شامل ہیں۔ ہمارے آباء واجداد پنڈت سماگم منعقد (عالموں کی مجلس) کیا کرتے تھے لیکن پرشکوہ تقاریر کی بے کیفی کو توڑنے کے لیے ان کے ہاں سنسکرتی کھیل کے مستقل کردار ودوشک کی صورت میں بھانڈ بھی ہوا کرتے تھے۔ ان کھیلوں ہی میں سے ایک میں وہ ''مباحثے'' کو کچھ یوں بیان کرتا ہے:

''جب مجھے پتہ چلا کہ عالموں کی کانفرنس منعقد ہونے والی ہے تو میں دوڑا چلا آیا۔ کانفرنس اصل میں ہوتی کیا ہے، کھانے، پینے اور گپ لڑانے کا ایک بہانہ اور یہ تینوں وہ کام ہیں جنہیں سرانجام دینا مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔''

❖ ○ ❖

کلکتہ کی تین صدیاں

اب سے چند دن بعد 24 اگست کو کلکتہ اپنا تین سوواں جنم دن منائے گا۔ کلکتہ میں ہر کوئی اس جنم دن کے متعلق بات کر رہا ہے اور لوگ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر بھی رہے ہیں۔ ان لوگوں میں سے دو منجوشری کھیتان (اداکار) اور سہیل سیٹھ (ورکشاپ کے انتظامی سربراہ) ہیں جنہوں نے اس موقع کو یادگار بنانے کے لیے جو کچھ ان کے ذہن میں ہے اس کے متعلق بات چیت کرنے کے لیے مجھے بلایا تھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی بنگالی نہیں ہے' منجوشری مارواڑی ہے اور سہیل پنجابی۔ دونوں طبقے کلکتہ کے مقروض ہیں اور وہ دونوں اس قرض کا کچھ حصہ لوٹانے کے لیے بے تاب ہیں جو اس شہر کا ان کے ذمے ہے۔ یہی وہ شہر ہے جس نے ان کی دیکھ بھال کی اور بنگالی ہونے کے ناتے ان کے تشخص کا باضابطہ اعلان کیا۔

میں شام ڈھلے آنے والی فلائٹ کے ذریعے کلکتہ پہنچتا ہوں۔ گیسٹ ہاؤس میں مجھے میرے کمرے تک پہنچانے پر آدھی رات کا وقت ہو چکا ہے۔ میرے پاس ایک بلند و بالا رہائشی عمارت کی آٹھویں منزل پر کونے کا کمرہ ہے۔ بارش سے شرابور ٹھنڈی ہوا کا کمرے میں گزر ہے جبکہ ائیر کنڈیشنر یا پنکھے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہ خدا کا اپنا نظام ٹھنڈک ہے اور اتنا ہی خاموش ہے جتنا کہ ہو سکتا ہے۔ مجھے بمشکل یقین آتا ہے کہ میں دنیا کے سب سے پرشور اور گنجان آباد شہر میں موجود ہوں' میں اونگھنے لگتا ہوں۔

کلکتہ میں صبح' کوئلوں کی چیخ و پکار اور کوؤں کی کائیں کائیں کے ساتھ جلد طلوع ہو جاتی ہے۔ علاقے میں اپنی موجودگی کے اعلان کے لیے کوئل ایک ہی بولی کی تکرار پر مشتمل ترانہ سناتی ہے۔ اس وقت تک کاریں اور بسیں لوگوں سے بھری ہوئی سڑکوں پر اپنا راستہ بنانے کے لیے صبح کی سیر کرنے والوں کو ہارن بجا بجا کر پرے ہٹانے لگتی ہیں۔ اچانک مجھے گھنٹیوں کے جھنجھنانے اور انسانی آوازوں کے امتزاج سے ''بول' بول'' جیسے الفاظ کی تیز آواز سنائی دیتی ہے۔ کیا یہ کوئی جنازہ ہے جو ''ہری بول'' چلا رہا ہے؟ میں جنازوں کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں اور وہ بھی کلکتہ میں جہاں لوگ اپنے مردوں کے چہروں کو بغیر ڈھانپے لے کر جاتے ہیں۔ میں جست لگا کر بستر سے نکلتا ہوں اور اپنی کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگتا ہوں۔ یہ کوئی جنازہ نہیں ہے بلکہ مردوں کی ایک طویل قطار ہے جنہوں نے اپنے کندھوں پر بانس اٹھا رکھے ہیں جن کے دونوں سروں پر چھوٹے چھوٹے برتن اور ڈھیر ساری گھنٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ میں غور سے سنتا ہوں تو ان کے نعرے مجھے سمجھ آنے لگتے ہیں۔ بم بم بھولے پار لگائے گا! ترک بابا پار لگائے گا! ایک ٹولی سڑک کے اختتام پر غائب ہو جاتی ہے تو دوسری آ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ صبح سے لے کر رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ مجھے پتہ چلتا ہے کہ ساون کے مہینے کے دوران لوگ ترکیشور میں شیوا کے مندر کا شیولنگ دھونے کے لیے کالی دیوی کے مندر کے نزدیک شیرو پلی گھاٹ سے گنگا کا پانی لے جانے کی قسم کھاتے ہیں۔ اس دوران پانی بھرنے کے لیے ہاتھ لیے جانے والے برتن زمین کے ساتھ نہیں لگنے چاہئیں۔

26 کلومیٹر طویل سڑک کے ساتھ ساتھ چبوترے بنائے گئے ہیں جہاں بانس کے تنوں کو زمین سے اچھی خاصی بلندی پر رکھا جا سکتا ہے۔ زیادہ عقیدت اور مضبوط ٹانگوں والا اس زیارت کو بغیر رکے سرانجام دیتا ہے۔ بھولے بابا ترکیشور ان کے من کی مرادیں پوری کرے حالانکہ میں 100 مرتبہ سے زائد بار کلکتہ جا چکا ہوں لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ کلکتہ کے پاس سنانے کے لیے ہمیشہ سے کچھ نیا ہوتا ہے۔

ہم کام کی بات پر آتے ہیں منجو شری کھیتان پنجابی شلوار قمیض میں ملبوس ایک پرکشش' دراز قد' دبلی پتلی اور دھیمے لہجے کی مالک خاتون ہے۔ وہ منصوبہ اس کے بچے کی

طرح ہے جو ان کے ذہنوں میں ہے' سہیل سیٹھ وہ سب بیان کر دیتا ہے۔ یہ دونوں مل کر دو جلدوں پر مشتمل ادب اور ادبی لوگوں کے متعلق کتابوں کا ایک سیٹ بنائیں گے جو کلکتہ چاہنے والوں کے لیے اپنے پاس جمع کرنے کی چیز ہوگی۔ ایک جلد بے مثال مصور آر۔ کے لکشمن کی بنائی ہوئی تصویروں پر مشتمل ہوگی جبکہ دوسری جلد 24 اگست 1690ء' جب جاب چرنوک سوتانتی کے مقام پر اترا تھا' سے لے کر اب تک جو کچھ بھی کلکتہ کے متعلق لکھا یا کیا جا چکا ہے اس کو مرتب کر کے تیار کی جائے گی۔ جاب چرنوک نے وہ جگہ جہاں کلکتہ کو تعمیر ہونا تھا تیرہ سو روپے کی خطیر رقم سے حاصل کی تھی۔ اسے ڈینیل اور ایملی ایڈن سے لے کر اب تک کے مشہور انگریز اور ہندوستانی مصوروں کے فن پاروں سے سجایا جائے گا۔ نوجوان محققین کی ایک ٹیم پہلے ہی سے نیشنل لائبریری' ایشیاٹک سوسائٹی اور وکٹوریا میموریل میں دستیاب مواد کا جائزہ لینے میں مصروف عمل ہے۔ تیار کیے جانے والے اس مجموعے کی تدوین کے لیے میری خدمات حاصل کی گئی ہیں' ان دو جلدوں کی اشاعت کا ذمہ رولی بکس کے مالک پرمود کپور کے سر ہے۔

شام کے وقت ہم نیشنل لائبریری کے سربراہ اشم داس گپتا کے ساتھ تھے۔ تین سو دیں جنم دن کو منانے کے لیے ان صاحب کے پاس اپنا ایک منصوبہ ہے۔ مختلف زبانوں میں کلکتہ پر لکھی جانے والی تقریباً دو ہزار کتب پر مشتمل ایک فہرست مرتب کرنے کے لیے انہوں نے کھپن نیرؔ کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو کلکتہ کے ساتھ عمر بھر کی وابستگی رکھتے ہیں۔ پھر شیو پرساد سما در ہیں جو کہ معلومات کا ذخیرہ ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ کلکتہ کے متعلق جو بات انہیں نہیں معلوم ہے' وہ اتنی اہمیت ہی نہیں رکھتی کہ اُسے جانا جائے۔ انہیں کلکتہ پر لکھی جانے والی نظموں کا ایک مجموعہ تیار کرنا ہے۔

کلکتہ کو بدنام کرنے والوں کی تعداد کلکتہ کو چاہنے والوں سے ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ تمام بنگالی کلکتہ کے چاہنے والوں میں شمار ہوتے ہیں جبکہ صرف چند غیر بنگالیوں کے پاس اس شہر کے متعلق کہنے کے لیے کچھ اچھے تاثرات ہیں۔ غیر بنگالیوں میں جنہوں نے اس شہر کے ساتھ محبت کی' ان میں سے اسد اللہ خاں غالب شامل ہیں۔ غالب باہر والوں کی اس شہر کی توہین کرنے کی عادت سے بخوبی آگاہ تھے:

''آہ! تم بھی کلکتہ پر تہمت باندھتے ہو
میرے دوست کیا تم جانتے ہو یہ بات
میرے دل کو چیر ڈالتی ہے!''

بظاہر لگتا ہے کہ اس وقت کلکتہ کی اپنی شراب کشید ہوا کرتی تھی۔ جیسا کہ غالب لکھتے ہیں ''شہر کی عمدہ شراب امید کی بہار کو چھو لیتی ہے اور نہایت شیریں عورتیں اپنی آنکھوں کی زبانی مطالب کا ایک جہان بیان کرتی ہیں'' غالب نے اعتراف کیا: ''بالآخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مجھے کلکتہ سے محبت ہے۔''

جنم اشٹمی

گزشتہ جنم اشٹمی میں نے ایک مسلمان گھر میں راجستھانی اور مارواڑی بولی میں میرا بائی کے بھجن گاتے ہوئے مسلمان لوک گلوکاروں کو سنتے ہوئے منائی تھی۔ چونکہ یہ نوروز ہونے کے ساتھ ساتھ میرے دوست رام نواس مردھا کی سالگرہ بھی تھی اس لیے موم بتیوں سے آراستہ روایتی کیک کے ہمراہ "ہپی برتھ ڈے ٹو یو" کی نیم دلانہ بڑبڑاہٹ بھی موجود تھی۔ یہ طبقات کا عجیب سا سنگم تھا اور پینے پلانے کی پرانی روایات جدید صاحب لوگوں کے ساتھ گھل مل رہی تھیں یعنی جو تم چاہتے ہو کرو اور جو میں چاہتا ہوں' وہ میں کروں گا' کا سا سماں تھا۔ کچھ مہمان درمیانی رات تک جبکہ ننھے کرشن بحفاظت جمنا پار نہیں کر پائے تھے روزہ رکھے ہوئے تھے جبکہ باقی لوگ چاکلیٹ کیک کو شیمپین کی مدد سے حلق سے نیچے اتار رہے تھے۔

لانگز طبقے کے افراد سے میری یہ پہلی ملاقات تھی جو راجستھان کے ضلع برمیر کے بنجر صحرا کے مکین تھے۔ اس طبقے کے آدھے لوگ ہندوستان کی سرحد میں ہیں اور باقی آدھے پاکستان میں رہتے ہیں۔ سب مسلمان ہیں لیکن چاہے ہندوستانی ہوں یا پاکستانی انہوں نے کرشن اور ہندو راجپوت جنگجوؤں کی شان میں قصیدے پڑھنا جاری رکھا ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ان کے آباؤاجداد پڑھا کرتے تھے۔ رحمت اور اس کے آٹھ سالہ بیٹے محمد رفیق کا تعلق برھنوا گاؤں سے ہے۔ دونوں راجستھانی طرز کے انگرکھے اور

بڑے بڑے رنگین پگڑ پہنتے ہیں۔ باپ سندھی سارنگی بجاتا ہے جو اس نے خود بنائی ہے جبکہ اس کا بیٹا ہسپانوی ساز ''Castanets'' کی ہندوستانی شکل کھڑک پر اس کا ساتھ دیتا ہے۔ پچھلے پندرہ سالوں سے وہ دہلی میں رہ رہے ہیں اور لندن اور نیویارک کے ہندوستانی میلوں میں گا چکے ہیں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ وہ کہاں ہیں اور آیا اپنی زمینیں کاشت کرتے ہیں' فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں یا سرکاری دفتروں میں' وہ دن کا کچھ وقت اپنے لوک گیت گا کر ضرور گزارتے ہیں۔ یہ صرف حالیہ چند سالوں میں ہوا ہے کہ راجستھان کے شعبہ سیاحت اور دوردرشن نے انہیں ہندوستانی اور غیر ملکی سامعین کے سامنے پیش کیا ہے۔

یہ اس قسم کی روایت ہے' جسے ہمارے جیسے ملک میں زندہ رکھنا چاہیے جہاں امن کو بنیاد پرستانہ کینہ پرور مذہبی اضطراب نے خاکستر کر دیا ہے۔

آزادی کی سالگرہ

بھارت کی آزادی کی تینتالیسویں سالگرہ کے موقع پر میں شیوالکس میں موجود تھا۔ صنوبر کی شجرکاری سے آراستہ سرسبز پہاڑیاں' گزشتہ تین دن اور راتوں کے دوران ہونے والی وقفے وقفے سے برسنے والی موسلادھار بارشیں' ایک طرف برف سے ڈھکے ہوئے دھند کے نقاب سے تاک جھانک کرتے ہوئے کوہ ہمالیہ کے سیر بین مناظر اور دوسری جانب مون سون سے بھیگے پنجاب کے میدان موجود تھے۔ ایسا وقت شاذونادر ہی میسر تھا کہ جب میں چیزوں کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا اور یہ عمل یوم آزادی کے موقع پر میری سوچ کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ اس سال میں نے کامیابیوں یا ناکامیوں کی بیلنس شیٹ مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ میرے نزدیک جو چند بڑی غلطیاں ہم کر چکے ہیں اس پر توجہ مرکوز کی ہے۔

کیا ہمارا اپنی تمام بالغ آبادی کو ووٹ ڈالنے کا حق دینے کا فیصلہ درست تھا؟ مجھے شدید شکوک وشبہات گھیرنے لگے ہیں۔ کیا ایسے لوگ جنہوں نے قومی خزانے میں مادی پیداوار' زرمبادلہ' پانی کی قیمتوں یا ٹیکسوں کی مد میں قطعاً کوئی حصہ نہیں ڈالا کیا انہیں ان مردوزن کو چننے میں جو یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ لوگوں کے پیسے کو کس طرح خرچ کیا جائے' ویسا ہی حق حاصل ہونا چاہیے جیسا کہ دوسرے لوگوں کو حاصل ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوتا کہ ہم حق رائے دہی کو ان لوگوں تک محدود کر دیتے جنہوں نے سکول کی تعلیم مکمل کی ہوتی اور

مطلوبہ امیدوار کم از کم سند یافتہ ہوتے؟ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم ایسا کرتے تو ہم سیاستدانوں کے ان گندی وتاریک گلیوں کو قائم رکھنے پر قابو پا سکتے تھے جو انہیں ووٹ بینک فراہم کرتی ہیں اور اس طرح ہماری قانون ساز اسمبلی کے اراکین کا معیار موجودہ معیار سے بہتر ہوتا۔

کیا ہم ذات پات کی بنیاد پر نوکریوں اور ترقیوں میں مشروطیت قائم کر کے درست کام کر رہے ہیں؟ کیا ہمارے لیے اپنے آباء واجداد کے گناہوں کی سزا آنے والی نسلوں کو دینا ضروری ہے؟ ان کی مراعات میں ہر طرح سے اضافہ کریں' انہیں سکولوں اور کالجوں میں مفت تعلیم دے کر انہیں چپڑاسیوں' کلرکوں' سپاہیوں اور فوجی جوانوں کے طور پر بھرتی کیا جائے اور ایسی نوکریاں فراہم کریں جہاں مخصوص مہارت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس کے بعد صرف میرٹ شمار کیا جانا چاہیے۔ ورنہ' ہماری ترقی کی رفتار سست پڑ جائے گی اور ہم دنیا کی پیچھے رہ جانے والی قوموں کے درمیان کھڑے ہوں گے۔

ایک اور غلطی جو ہم نے کی وہ لسانی خطوط پر ریاستوں کی حد بندی تھی' اس سے انتظامی طور پر کوئی فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو' البتہ اس نے لسانی اور علاقائی تسلط کے آغاز سے بڑھ کر کام دکھایا۔

اور سب سے فاش غلطی جو ہم نے کی وہ خاندانی منصوبہ بندی کو پارلیمانی قانون سازی کے ذریعے لازم قرار نہ دینا تھا۔ یہ اس وقت کیا جا سکتا تھا جب ہمارے پاس پنڈت نہرو کی شکل میں ایک طاقتور وزیراعظم موجود تھا اور آج کی نسبت پارلیمنٹ زیادہ دور اندیش اور ذمہ دار اراکین پر مشتمل تھی۔

میرے ہم عمر ہندوستانیوں کے لیے میرے خیالات قابل قبول ہیں یا نہیں' اس کے متعلق مجھے کوئی وہم نہیں ہے۔ میری امیدیں قدرے جوان نسل سے وابستہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نوجوان نسل ان خیالات پر غور کرے گی اور انہیں قابل قبول پائے گی۔

❖ O ❖

بچوں کا عالمی دن

تمام کار سواروں کو سڑک کے ہر چوراہے پر تین قسموں کے تکلیف دہ افراد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کو اٹھائے ہوئے مانگنے والی عورتیں (یہ بچے ان کے اپنے ہوتے ہیں یا بھیک مانگنے کے لیے ادھار مانگے ہوئے ہوتے ہیں' کوئی نہیں جانتا ہے)' بازار میں آوارہ گھومنے والے بچے جو کاروں کے شیشے پونچھنے لگتے ہیں اور وہ لڑکے جو شام کے اخبار لوگوں کے چہروں کے آگے نچاتے ہیں۔ میں جونہی ٹریفک کی بتیوں کو سرخ ہوتا ہوا دیکھتا ہوں ان تکلیف دہ لوگوں سے بچنے کے لیے اپنی گاڑی کے شیشے چڑھانے لگتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ غریب ہیں' میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کے پاس گزر اوقات کے لیے کمائی کے دیگر ذرائع نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود مجھے انہیں کچھ دینے کے خلاف اپنے دل کو مضبوط کرنا پڑتا ہے' بھکاریوں کی حوصلہ افزائی بھیک مانگنے کو مستقل روزگار بنا رہی ہے۔

مجھے کسی کو آئی-این-اے بازار لے جانے کی ضرورت بہت کم ہی پڑتی ہے اور وہاں بھی یہی حالات ہیں مجھے گاڑی کھڑا کرنے کی جگہ ملنے سے پہلے ہی خالی ٹوکریاں اٹھائے لڑکوں اور لڑکیوں کے ہجوم گاڑی کو گھیر لیتے ہیں اور قلی بننے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر نو سے تیرہ سال کی عمر کے ہوتے ہیں۔ عام طور پر لڑکے مضبوطی کی بنا پر لڑکیوں سے جیت جاتے ہیں جبکہ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی قلی لینے والا شخص لڑکوں کو پرے دھکیل کر کسی لڑکی کو ایک دو روپے کمانے کا

موقع دیتا ہو۔ ہمارے غریب ملک کے بچوں کا شمار دنیا کے محروم ترین بچوں میں ہوتا ہے جبکہ ان بچوں میں لڑکیوں کی حالت لڑکوں کی نسبت بدترین ہے۔ دس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے لڑکوں کی نسبت کہیں زیادہ تعداد میں لڑکیاں مر جاتی ہیں کیونکہ ان کے ماں باپ ان کی صحت یا غذا کے متعلق فکرمند نہیں ہوتے ہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ معاملات کی بدترین صورتحال کی بہتری کے لیے ہم کچھ زیادہ کر سکتے ہیں۔

یونیسیف بچوں کے دن کا جائزہ (کوئی بھی منانے کا لفظ بمشکل ہی استعمال کرسکتا ہے) لے گی جبکہ اس سال ستمبر کی 29 اور 30 کو اقوام متحدہ کی جانب سے بچوں کے لیے عالمی کانفرنس کا اہتمام کیا جائے گا۔ دنیا کے رہنماؤں کی جانب سے بہت سی تقریریں ہوں گی۔ کیونکہ میں نے انہیں خطاب کرتے ہوئے سن رکھا ہے' اس لیے مجھے کسی حد تک گمان ہے کہ ہمارے مندوب اٹل بہاری واجپائی بیرونی ممالک کے مقررین میں سب سے بہتر تقریر کریں گے۔ کیا یہ کانفرنس ان معصوم لڑکوں اور لڑکیوں کو جو چوراہوں پر بھیک مانگتے ہیں یا آئی این اے مارکیٹ میں سرپرست کے لیے لڑتے ہیں فائدہ پہنچائے گی؟ بے شک نہیں میری سوچ بالکل واضح ہے' اپنے بچوں کی پود بہتر بنانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ نہ کیا جائے' ایک ابدی کنوارے اٹل بہاری واجپائی کی شکل میں ہم نے اپنی نمائندگی کے لیے نہایت موزوں انتخاب کیا ہے جبکہ یہ بات نہایت مضحکہ خیز ہوسکتی تھی اگر ہم بہار کے وزیر اعلیٰ لالو پرساد یادو کو بھیجتے جس کے ہاں حال میں نوواں بچہ پیدا ہوا ہے۔ کیا ان صاحب کو کوئی شعور نہیں ہے؟ ملک کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں ہے؟

مسجد بمقابلہ مندر

بابری مسجد اور رام جنم بھومی تنازعہ پر ہونے والی مزاجوں کی ہنگامہ آرائی میرے اس نظریہ کی تائید کرتی ہے کہ مدت ہوئی عبادت گاہوں کا پرامن و محفوظ مقام ہونے کا تقدس ختم ہو گیا ہے۔ ایسی جگہ جہاں لوگ خاموشی سے عبادت کر سکتے ہیں' خدا پر دھیان لگا سکتے ہیں' کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط ہے اس پر غور وفکر یا مصالحت کر سکتے ہیں' پجاریوں' محافظوں' ثناخوانوں اور بھیک مانگنے والوں کی آمدنی کا ذریعہ بن چکی ہیں۔ یہ ان آدمیوں کی اجارہ داری تھی جو مذہب کے کیسری لبادوں میں ملبوس تھے جبکہ اب انہیں کھڈی کا بنا کپڑا پہننے والے سیاستدانوں نے بری طرح اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' ایودھیا میں اخلاقی مسائل پیچیدہ نہیں ہیں۔ دونوں اطراف سے جو کچھ بھی تاریخی حقائق کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے وہ سب ناقابل ثبوت خرافات کا پلندہ ہے۔ کسی کو بھی شری رام کی پیدائش کا سال یقین سے نہیں معلوم جبکہ ایودھیا کے گردونواح میں بہت سے دوسرے مندر ہیں جو ان کی پیدائش کی جگہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جیسا کہ درجنوں معبدوں اور زیارات کو سیتا جی کی رسوئی بیان کیا جاتا ہے۔ یہ مندر اور معبد پانڈوں کو روٹی پانی مہیا کرتے ہیں۔ تاہم' ثبوت موجود ہے کہ اس جگہ جہاں بابری مسجد تعمیر کی گئی ایک مندر موجود تھا۔ بابر سنی تھا جبکہ بابری مسجد ایک شیعہ مسجد ہے۔ نصف صدی سے زائد عرصے تک کوئی نماز پڑھنے نہیں آیا اور اس کا واحد قابض ایک

بزرگ محافظ تھا۔ زیارت کے لیے پہلا ہندو بت کب اور کیسے وہاں پہنچا ٹھیک طرح سے معلوم نہیں ہے۔ کئی دہائیوں سے اس معاملے پر مقدمہ چل رہا ہے۔ یقیناً! کوئی بھی حکومت جو بہترین اقدام کرسکتی ہے' وہ ہے معاملے کو ملک کی سب سے بڑی عدالت کے سپرد کرنا اور اس سے بھی زیادہ یقینی طور پر ہر شہری کا یہ باقاعدہ فرض ہے کہ وہ عدالت کے فیصلے کو قبول کرلے' بے شک یہ اس کے حق میں ہے یا نہیں ہے۔ جب جھگڑا کرنے والی دونوں پارٹیاں کھلے عام اعلان کرتی ہیں کہ وہ عدالت کے فیصلے کا احترام نہیں کریں گی تو پھر حکومت کے پاس اس کے علاوہ کیا چارہ ہے کہ وہ جگہ کو اپنی تحویل میں لے لے اور کسی کی طرف سے بھی مسجد یا مندر میں خواہ مخواہ دخل اندازی کرنے کو ممنوع قرار دیدے۔

اس معاملے میں ایل کے ایڈوانی کے اختیار کردہ طرز عمل پر مجھے خاص طور پر تکلیف پہنچی جنہوں نے متنازعہ جگہ تک رتھ یاترا کی سربراہی کی۔ میں ان کے ایک صاف ستھرے' اہل اور دور اندیش سیاستدان اور ریاستی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ تحریک کے پیچھے جو بھی سیاسی مقاصد تھے وہ اپنی جگہ مگر انہیں یقیناً علم ہونا چاہیے کہ وہ احمق ہندو عناصر کے ہاں ہی سرفراز ہوئے ہیں۔ اور مسلمان اور پڑھے لکھے غیر مسلموں کی اکثریت انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ انہوں نے ملک کے دانشوروں کو نیچا دکھایا ہے۔ یہ ظاہر کرنا ان کا بھولا پن ہے کہ یہ فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں ہے۔ جب اس مسئلہ میں ایک مسجد کی تباہی اور اس کی جگہ ایک مندر کی تعمیر شامل ہے تو پھر ہندو مسلم تصادم کی بجائے اور کیا ممکن ہوسکتا ہے؟

تیسرا گاندھی

ہمارے سر شرم سے جھکے ہوئے ہیں۔ جو کچھ ہمارے بدنصیب ملک میں ہوا ہے اس پر ہم نے دکھ کے آنسو بہائے ہیں۔ ہم دل کی گہرائیوں سے سونیا' راہول اور پریانکا کے ساتھ ہیں۔ ان کا نقصان ہمارا نقصان ہے اور جب تک وہ راجیو کے بچھڑنے کا ماتم کریں گے ہم ان کے ساتھ شریک رہیں گے۔

یہ عجیب بات ہے کہ تین گاندھیوں کی زندگیاں اس طرح کے دردناک انجام سے دوچار ہوئیں۔ اگرچہ مہاتما کا دونوں سے کوئی رشتہ نہیں تھا جیسے وہ ہمارے باپو تھے بالکل ویسے ہی ان کے بھی باپو تھے۔ اگر وہ اپنے بچوں میں سے ہی ایک کے ہاتھوں قتل ہو سکتے تھے تو اس بات پر کسی کو حیرانگی نہیں ہونی چاہیے کہ اندرا گاندھی ان آدمیوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچیں جنہیں انہوں نے اپنی زندگی سونپ رکھی تھی اور جو ان کے قریب ترین تھے' پھر تیسرے گاندھی' راجیو کو ایسے لوگوں کے نصب کردہ بم کی نذر ہونا پڑتا ہے جن کے تحفظ کی خاطر اس نے اپنے ملک کی مسلح افواج کا کام اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ معنی خیز بات یہ ہے کہ تینوں گاندھیوں کے معاملے میں ان کے قاتلوں کو اپنے مطلوبہ افراد سے کسی قسم کی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ بلکہ وہ جس عہدے کی علامت یعنی وزیراعظم تھے قاتلوں نے انہیں اس کے لیے قتل کیا تھا۔

راجیو گاندھی سے بارہا ملنے کے حوالے سے میری قسمت بڑی شاندار تھی۔ کیمبرج

میں وہ میری بیٹی کا ہمعصر تھا۔ چند مرتبہ میں اس جہاز میں مسافر تھا جسے وہ اڑا رہا تھا اور اس کی طرف سے بھیجے جانے والی چائے سے لطف اندوز ہونے والوں میں سے تھا۔ اس کا اسلوب معصومانہ اور دلکشی بہت زوردار تھی۔ جب وہ وزیر اعظم بنا تھا تو میں نے اس سے کئی ملاقاتیں کی تھیں۔ جب اس نے سنت لونگووال کے ساتھ پنجاب کے معاہدے پر دستخط کیے تھے تو میں اس بہادری پر جو اس نے پنجاب کے بھینسے کو سینگوں سے پکڑنے کے لیے دکھائی' مبارکباد دینے کے لیے پارلیمنٹ میں اس کے پاس چل کر گیا تھا جبکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ جو کچھ اس نے قوم کے لیے کیا تھا اس پر وہ ''بھارت رتن'' کا مستحق تھا۔ جب اس نے معاہدے سے انحراف کیا تھا تو میں نے پارلیمنٹ اور ان کالموں میں اسے برا بھلا کہا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اگرچہ وہ مکمل شریف النفس انسان ہے لیکن وہ ایک غریب سیاستدان ہے۔ اس نے میری تعریف اور تنقید دونوں کو مسکرا کر قبول کیا تھا۔ میری اس سے آخری ملاقات میرے اپنے گھر میں ہوئی تھی جب وہ میرے بیٹے کی پچاسویں سالگرہ کی پارٹی میں اچانک آن پہنچا تھا۔ جو بات اس حادثے کی شدت میں اضافہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایسے وقت پر چلا گیا جب ایسا لگتا تھا کہ ملک کی وحدت عظمیٰ ایک بار پھر اس کی گرفت میں تھی۔ وہ ایک شریف النفس سیاستدان تھا جسے احساس نہیں تھا کہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی تھیں۔

سونے کی چڑیا اور انگریز شکاری

تمام فاتح افواج لوٹ مار' عصمت دری اور قتل و غارت کرتی ہیں' کچھ پر تو عوام کے ردعمل کی پروا کیے بغیر جوش جنون سوار ہو جاتا ہے لیکن برطانویوں نے اس عمل کو زیادہ ہوشیاری اور جامع انداز میں سرانجام دیا تھا۔ یہ میرے لندن کے زمانہ طالب علمی اور پھر اپنے ہائی کمیشن کے ہمراہ گزارے ہوئے سالوں کی بات ہے کہ میں نے کچھ مال غنیمت کو دیکھا جو انہوں نے پنجاب سے حاصل کیا تھا۔ بے شک وہاں کوہ نور ہیرا موجود تھا جسے مہاراجا رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے مہاراجا دلیپ سنگھ سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس کے تین ٹکڑے کیے گئے تھے۔ ایک ایک ٹکڑا شاہ برطانیہ اور ملکہ برطانیہ کے تاج میں اور ایک ٹکڑا ''ٹاور آف لندن میوزیم'' میں موجود تھا۔ وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم میں رنجیت سنگھ کا سونے کے پتروں سے آراستہ تخت موجود تھا۔ جنگی عجائب خانے میں لاتعداد ہتھیار' توپیں' بندوقیں' تلواریں' خنجر' ڈھالیں اور زرہ بکتر موجود ہیں۔ مسودے دستاویزات' منی ایچر پینٹنگز' الہامی کتابوں کے متن' دعوتی لباس غرضیکہ آپ کسی بھی قسم کی چیز کا نام لیں' وہ ان کے پاس موجود تھی۔ یہ سب انہوں نے اراکان سے سندھ تک اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے عمل کے دوران ہندوستان کے تمام علاقوں سے لوٹا تھا۔ گورنر جنرل' فوج کے کمانڈر' مقامی باشندوں اور اعلیٰ سرکاری عہدیداران کے حاصل کردہ انمول نمائشی ہتھیاروں کے علاوہ عجائب گھروں میں اور کیا دیکھنے کو مل سکتا تھا۔ یہ سارا ساز

وسامان قلعوں اور حویلیوں میں ذاتی طور پر جمع کیا گیا تھا جسے اب غارتگروں کی اولاد میں تقسیم کیا جا چکا تھا۔ ہمیں موہوم سی امید ہے کہ شاید کبھی ہم ان میں سے کچھ اپنے ملک واپس لے جاسکیں۔

یہ موضوع اس وقت میں سامنے اس لیے لایا ہوں کہ اس ہفتے بی بی سی کی ایک ٹیم انگلستان میں ذاتی تحویل میں موجود سکھ راج کی یادگاروں پر ایک ریڈیو ڈاکومنٹری بنانے کے لیے پہنچ رہی ہے۔ ابتدائی کام ہربنس سنگھ نے مکمل کیا ہے' یہ صاحب انڈیا ہاؤس میں میرے ساتھ کام کرنے والوں میں شامل تھے۔ ان کی صاحبزادی رانی پروگرام پروڈیوسر نامجل اٹچیسن کی ٹیم کے ہمراہ موجود ہے۔ مارک ٹیلی جو اس وقت ایک آزاد و خودمختار صحافی ہیں ہندوستانیوں سے اظہار خیال کروائیں گے اور میں بھی ان میں شامل ہوں۔

میرے علم میں جس قدر یادگار اشیا تھیں' ہربنس سنگھ اس سے کہیں زیادہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ سب سے زیادہ لوٹ مار لارڈ ڈلہوزی نے مچائی تھی جس نے 21 فروری 1849ء کو گجرات کے میدان جنگ میں سکھ دربار کے فوجیوں کو بالآخر شکست سے دوچار کرنے کے بعد پنجاب سے الحاق کر لیا تھا۔ 29 مارچ 1849ء کو ''کوہ نور'' جسے برطانوی سفارتکار پہلے دیکھ چکے تھے۔ انگریزوں کے سپرد کیا گیا تھا۔

اس کے بعد پنجاب میں موجود ہر قیمتی شے کو منظم طریقے سے لوٹنے کے عمل کی ابتدا کی گئی تھی ملکہ وکٹوریہ نے ونڈسر کے قلعہ کے لیے کچھ مخصوص اشیا کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کو اپنا حصہ چاہیے تھا' بہت کچھ ڈلہوزی اپنے لیے رکھنا چاہتا تھا جبکہ جو کچھ باقی بچا وہ دوسرے انگریز افسروں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ ان میں سے کچھ اشیاء کا ریکارڈ کلکتہ اور لندن کے درمیان ہونے والی خط و کتابت میں موجود ہے۔ لیکن وہ بیشتر مال غنیمت جسے فوجی اور غیر فوجی انگریز افسروں نے اپنی جیبوں میں ٹھونسا' اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

ریکارڈ میں موجود خط و کتابت میں 19 دسمبر 1850ء کو ڈلہوزی کی جانب سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کو لکھا جانے والا ایک خط موجود ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ وہ انہیں دو تلواریں بھجوا رہا ہے جس میں سے ایک ہولکر کی جانب سے رنجیت سنگھ کو دی

گئی تھی اور دوسری رستم کے نام سے جانی جاتی تھی جس کے پھل پر اس کے استعمال کرنے والے کا شجرہ نسب سنہری حروف سے کندہ ہے۔ اس نے مزید لکھا کہ ''ان کے ساتھ میں نے کچھ غیر معمولی دستاویزات بھی بھجوائے ہیں جو انگلستان میں محفوظ کیے جانے کے قابل ہیں۔'' ان اہم دستاویزات میں گورو گوبند کے ہاتھ سے قلمبند کردہ ''دسم گرنتھ'' کی ایک جلد بھی شامل تھی۔ اسی خط میں وہ پوچھتا ہے کہ آیا وہ سونے کی بنی کرسی جس پر بیٹھ کر مہاراجا اپنا دربار لگایا کرتا تھا' خنجر اور تلوار جو کہ سکھ روایات کے مطابق گرو گوبند کی ملکیت تھی اور ایک چاندی کے بنے بنگلے کو اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں۔ اگر ڈائریکٹر صاحبان انہیں حاصل کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تو کیا ڈلہوزی انہیں اپنے لیے رکھ سکتا ہے؟

یہ سب تو محض سکھ راج کی چند یادگاریں ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی' کلائیو اور وارن ہیسٹنگز جیسے ٹھگوں نے اس سے کہیں زیادہ مال غنیمت مدراس' کرناٹک' بنگال' اودھ اور مراٹھہ کے علاقوں سے حاصل کیا تھا۔ حتیٰ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سمیٹے جانے کے بعد بھی وائسرائے اور گورنر حضرات نے ہندوستانی شہزادوں سے ملاقات کے وقت جب وہ ان کی ریاستوں کے دوروں پر جاتے تھے بیش قیمت تحائف وصول کیے۔ ان تحائف کا کچھ حصہ خزانے میں اور کچھ وصول کرنے والے کی جیب میں چلا جاتا تھا۔ ہندوستان سے حاصل شدہ تمام مال غنیمت اب انگلستان میں موجود ہے۔

کیا ہم اس میں سے کچھ اپنے ملک واپس لانے کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ ہمارا بہترین داؤ اقوام متحدہ یا اس کی کسی یونیسکو جیسی تنظیم کو اس قرارداد کے منظور کرنے کے لیے قائل کرنا ہے کہ جنگ کے جرمانے کے طور پر حاصل کی گئیں تاریخی یا فنکارانہ اہمیت کی حامل اشیاء کو ان کے اصل ممالک کو واپس لوٹا دیا جائے۔

❖ O ❖

خالصوں کی بیساکھی

بیساکھ کی پہلی (13 اپریل) کا عظیم دن آتا ہے اور آنند پور جانے والی تمام سڑکیں پیدل پہنچنے والے زائرین' کاروں' ٹرکوں اور ڈبل ڈیکر بسوں کی شکل میں تبدیل کیے ہوئے ٹریکٹروں سے کھچا کھچ بھر جاتی ہیں۔ تقریباً 30 لاکھ مہمانوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے انتظامیہ نے تیاری کر رکھی ہے۔ شہر کے اردگرد ہزاروں کی تعداد میں خیمہ بستیاں' کینٹینیں اور ابتدائی طبی امداد کے مراکز آباد ہو گئے ہیں۔ بندوبست بالکل پکا ہونا چاہیے کیونکہ ایک بھی تکلیف دہ واقعہ کی صورت میں صورتحال بہت بگڑ سکتی ہے۔ مرکزی معبد کے داخلی راستے پر ہر وقت ایسی صورتحال ہوتی ہے کہ جیسے ابھی بھگدڑ مچ جائے گی۔ آج صبح سویرے ایک بزرگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے اردگرد موجود انسانوں کے ہجوم کا دباؤ برداشت نہیں کر سکے اور انتقال کر گئے۔ ہر کوئی یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ ''وہ گرو کے دربار کی دہلیز پر آنے والی موت سے بہتر موت کا طلبگار نہیں ہو سکتا تھا''۔ انہیں اس کی خاک زیادہ دور نہیں لے جانا پڑے گی' کیرت پور یہاں سے بمشکل چار میل دور ہے۔''

میں خوش قسمت ہوں۔ اب کی بار مجھے سڑک کے راستے سفر نہیں کرنا پڑا۔ مجھے اور میری پوتی نیناں کو ہیلی کاپٹر میں سوار کر لیا گیا تھا جو وی آئی پی حضرات کو لے جا رہا تھا جس میں ڈاکٹر جسپال سنگھ' جنرل جگجیت سنگھ اروڑا اور آہلو والیے' مونتک اور اس کی بیوی ایشر شامل تھے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ کہیں ہم پیچھے نہ رہ جائیں' ہم سب سے پہلے ایئرپورٹ پر پہنچنے والوں سے تھے۔ ہمارے پائلٹ کرنل اے-پی-ایس دھونیا ہمارا استقبال کرتے ہیں۔ ہیلی

کاپٹر میں سوار ہو کر اپنی سیٹ بیلٹس کسنے میں ہم سب سے آگے ہوتے ہیں۔ کل جس سفر کو سڑک کے راستے طے کرنے میں چار گھنٹے لگے تھے آج اسے طے کرنے میں ہمیں بمشکل 15 منٹ لگے ہیں۔ لیکن اڑنے والی گرد کی وجہ سے دکھائی بہت کم دیتا ہے اور ہم سفید پتھروں کے بنے گردوارے یا اس کے اوپر پہاڑی میں نیناں دیوی کے مندر کی شاندار جھلک دیکھنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ گرد و غبار کے مرغولے میں لپٹے ہم دش میش اکیڈمی کے میدان میں اتر جاتے ہیں۔ جنگل میں ڈھک اور نیلم کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہمیں پنڈال کے لیے روانہ ہونے سے پہلے تازہ دم ہونے کے لیے آدھے گھنٹے کا وقت دیا جاتا ہے۔ پنڈال میں ان لوگوں کو خراج تحسین پیش کیا جائے گا جو خالصہ پنتھ کے لیے نیک نامی کا باعث بنے تھے۔

اکیڈمی گیسٹ ہاؤس سے پنڈال تک کا گاڑی میں بیٹھ کر' شہر سے گزرتے ہوئے کیا جانے والا مختصر سا سفر بھی ایک ناقابل فراموش تجربہ ہے۔ وہاں موجود کیسری اور نیلے رنگوں سے سجی مردوں' عورتوں اور بچوں کی ہنستی مسکراتی ٹولیاں نہ جانے کدھر سے کدھر کو آ جا رہی تھیں اگرچہ بہت دھکم پیل ہے لیکن کوئی بھی مرد یا عورت آپے سے باہر نہیں ہوتا ہے۔ پولیس والے اپنی عادت کے برخلاف نہایت مہذب ہیں اور لوگوں کو ''بہن جی' بھائی جی'' وغیرہ وغیرہ کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں۔ نہنگ حضرات اپنی اجنبی سی وردیوں کی نمائش کرتے ہوئے اور وقفے وقفے سے جنگی نعرہ ''جو بولے سونہال!'' بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر کوئی شکم سیر اور پُر جوش دکھائی دیتا ہے۔

ہم مرکزی پنڈال میں پہنچتے ہیں۔ یہاں اسی ہزار سے زائد عورتیں اور مرد موجود ہیں جو کیسری' نیلے اور سفید رنگوں کا ایک سمندر دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے بہت سی اہم شخصیات نظر آ رہی ہیں جن میں امریکی سکھوں کی امدادی فوج کے ہمراہ یوگی بھجن' سفید چپٹی پگڑیوں میں نام دھاریے اور سروں کو رومالوں سے ڈھانپے ہوئے بہت سے ہندو شامل ہیں۔ زراعت کے وزیر گردیو سنگھ بادل اپنے سامنے مائیک تھامے ہوئے کھڑے ہیں۔ سامعین کو گرو گوبند سنگھ اور پانچ پیارا کے درمیان ہونے والے من گھڑت مکالمے سنا کر خوش کرنے کے بعد وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ کس طرح جے للیتا نے اپنے گود لیے ہوئے بیٹے کی شادی ہوائی جہاز میں منائی اور کس طرح بمبئی کے ایک صنعت کار نے جو جے للیتا کو نیچا دکھانا چاہتا تھا اپنے بیٹے (یا بیٹی) کی شادی کی رسم ایک آبدوز میں بیٹھ کر سمندر کی تہ میں سرانجام دی

اور کس طرح گرو گوبند سنگھ نے اپنی بیوی ماتا سندری کو کسی ہچکچاہٹ اور بیٹوں کی رضامندی کے بغیر اُن تمام کی نسبت طے کرنے کی اجازت دی تھی۔ ایم پی کنول جیت سنگھ دھندسا نے بارہا ان کے کندھے کو تھپتھپایا اور بات سمیٹنے کے لیے کہا' مگر وہ مزید بڑھتے چلے گئے۔ وہ سامعین کو شیشے میں اتار چکے ہیں اور نہایت محظوظ ہو رہے ہیں۔ انہیں چیف ایڈمنسٹریٹر کا پسندیدہ قرار دیا جاتا ہے اور ان کا تعلق بھی ان ہی کے گاؤں سے ہے۔ بالآخر سامعین بے چین ہونے لگتے ہیں اور آپ اپنی طویل لچھے دار اور بے بنیاد تقریر کو ختم کر دیتے ہیں۔

اب اُن خواتین و حضرات کو جن پر خالصہ فخر کرتے ہیں' اعزازی اسناد اور یادگار تحائف عطا کرنے کے اصل کام کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ فوجیوں' ہوابازوں' ایورسٹ کے فاتحین' حریت پسندوں' ادیبوں' فنکاروں اور فلاحی کام کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیادہ تر کو مرنے کے بعد اعزاز سے نوازا گیا ہے جبکہ ان کی جگہ ان کی بیوائیں یا ان کی اولاد ایوارڈ وصول کرنے کے لیے آتی ہے۔ بہت سے ایوارڈ وصول کرنے والے جو ابھی زندہ ہیں' ضعیف العمر ہو چکے ہیں اور اسٹیج پر آنے کے لیے ان کی مدد کرنا پڑتی ہے۔ سب سے بلند داد (خالصہ تالی نہیں بجاتے وہ ''بولو جے کارا'' کہتے ہیں) سنت بابا ورشا سنگھ کے حصے میں آتی ہے جو اپنے حالیہ دو سو شاگردوں کے ساتھ جن میں بی۔ ایل شرما اور پریم بھی شامل ہیں' وہاں پہنچتے ہیں۔ ورشا سنگھ ایک طویل القامت شخص ہیں جو اپنی سفید پگڑی اور برف جیسی سفید لہراتی ہوئی طویل داڑھی کے باعث مزید طویل القامت نظر آتے ہیں۔ پنڈال ''بولے سونہال' ست سری اکال'' کے بارہا لگائے جانے والے نعروں سے گونجنے لگتا ہے۔

چندی گڑھ کے کچھ صحافی مجھ سے دعا سلام کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ''اس سارے عمل پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟'' آپ تو ایک ''اعتقاد نہ رکھنے والا'' ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔

میں دیانتداری سے جواب دیتا ہوں: ''میں استقبال کے سحر میں مبتلا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے بنانے والے سے (اگر کوئی ہے) میری ملاقات کا وقت نزدیک آ رہا ہے۔ غالباً بذات خود جو وہ مجھ سے بات نہیں کرتا ہے تو مجھے اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں اسے اپنا ایوارڈ دکھاؤں گا اور اس سے کہوں گا کہ خالصہ پنتھ نے مجھے جنت میں داخل ہونے کے لیے پرکاش سنگھ بادل کا دستخط کردہ پاسپورٹ دے دیا ہے۔ مجھے تم سے ویزہ کی ضرورت نہیں ہے۔''

❖ ○ ❖

تیسرا حصہ

آئینے کے رُوبرو

سزا بذریعہ ادویات

کچھ عرصہ پہلے دہلی کے ایک جج نے آبروریزی کے ایک مجرم کو عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ اس وقت میں نے تجویز پیش کی تھی کہ اس مجرم کو دی جانے والی زیادہ موزوں سزا یہ ہوسکتی ہے کہ اسے باقی ماندہ زندگی جیل میں گزارنے (ہندوستان میں عمر قید کا مطلب 10 سال سے زائد عرصہ جیل میں گزارنا ہے) یا سرجری کروانے (جو اسے ہمیشہ کے لیے سیکس کے مزے لوٹنے سے محروم کردے گی) میں سے کسی ایک سزا کو اختیار کرنے کا حق دیا جائے۔ ایک ڈاکٹر دوست نے مجھے یہ بتایا ہے کہ جب ایسی ادویات موجود ہیں جو آدمی کے سیکس کرنے کی خواہش کو بتدریج کم کرسکتی ہیں تو پھر خصی کرنے جیسے سخت اقدامات اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان ادویات کا واحد سائیڈ ایفیکٹ مردانہ چھاتیوں کا عورتوں کی چھاتیوں جتنا بڑھ جانا ہے۔ جس میں کوئی بڑی مصیبت نہیں ہے۔ سزاؤں کو اس طرح کی زیادہ معقول صورت میں نافذ کرنے کے لیے سب سے بڑی دشواری قانون کی منظوری حاصل نہ ہونا ہے۔ ہندوستان پینل کوڈ تشکیل دینے والے حضرات جرمانے، قید یا پھانسی کے علاوہ دوسری سزائیں نہیں سوچ سکتے ہیں، اگر ہم جرم اور سزا کے درمیان بننے والی مساوات کی از سر نو تشکیل کرتے اور ان کے تعلق کو مزید معقول بنانے کے لیے جدید ادویات سے استفادہ حاصل کرتے تو یہ کوئی بری بات نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے چند مسلم ممالک میں رائج ہاتھ پاؤں کاٹ دینے جیسے عمل کو اختیار کیے

بغیر مخصوص نوعیت کے جرائم میں کمی ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ مجرموں کو لمبے عرصے تک جیل میں رکھنے کی مد میں لیے جانے والے قرضوں جیسے مالی اخراجات بھی کم ہوں گے۔ اس موضوع پر ایک عوامی مذاکرے کے آغاز کے لیے میں درج ذیل تجاویز پیش کرتا ہوں: اول، قتل کی سزا موت نہیں بلکہ مخصوص سالوں کے لیے قید بامشقت ہونی چاہیے جبکہ مجرم کی آمدن قتل ہونے والے کے خاندان کو دینے کے ساتھ ساتھ مجرم کی ذاتی جائیداد کو بھی ضبط کر کے مرنے والے کے خاندان کو منتقل کر دینی چاہیے۔ دوئم، ایسے جرائم کی سزا جن کا نتیجہ موت کی بجائے شدید جسمانی نقصان کی صورت میں ہو، اس کی سزا بھی جائیداد کی ضبطی ہونا چاہیے اور جیل میں رہنے کے دوران (جسے تین سالوں سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے) کی جانے والی کمائی بھی زخمی ہونے والے شخص کو ملنی چاہیے۔ سرعام کوڑے لگائے جانے جیسی جسمانی سزائیں بھی متعارف ہونی چاہئیں۔ سوئم، سیکس، بچوں کے ساتھ زیادتی اور آبروریزی کی کوشش جیسے جرائم کو ادویات کی یقینی وزارت سے سزا ملنی چاہیے جو خصی کر کے سیکس کی لہر اور حقیقی آبروریزی کو کم کر سکتے ہیں۔ چہارم، شراب کی زیادتی اور عادت کی بنا پر ہونے والے تشدد اور مارپیٹ کے جرائم کی سزا میں انٹابیوز (Antabuse) جیسی ادویات کا لازمی استعمال ہونا چاہیے، جسے اگر الکوحل کے بعد استعمال کیا جائے تو طبیعت کے لیے نہایت ناخوشگوار تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ایسا شخص جو Antabuse کھانے کے بعد تھوڑی سی پیتا ہے تو وہ بری طرح بیمار پڑ سکتا ہے اور اتنی شدت کا نشہ اس پر طاری ہوسکتا ہے کہ جو اسے شراب کو کبھی بھی ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ میں اسے ان بیویوں کو تجویز کر سکتا ہوں جنہیں اپنے سخت شرابی شوہروں کے ہاتھوں بے عزتی اور تشدد سہنا پڑتا ہے۔

ان تجاویز کے متعلق پڑھنے والوں کے تاثرات کو خوش آمدید کہا جائے گا۔

❖ ○ ❖

جنت' دوزخ اور اقبال

بنی نوع انسان اس دنیا میں نہیں تو پھر مرنے کے بعد کی زندگی میں خدائی انصاف کے وہم کی پرورش کرنے میں مصروف رہتے ہیں' میں جو مرنے کے بعد کی زندگی میں یقین نہیں رکھتا ہوں دنیا میں ہر طرف پھیلی ناانصافی کو سر پر سوار کیے رکھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ میں مرنے کے بعد کی زندگی میں یقین رکھنے والوں سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ بھنڈراں والا اس وقت کہاں ہے؟ دوزخ کی آگ میں بھونا جا رہا ہے جیسا کہ اس کو برا بھلا کہنے والوں کو امید ہے یا خدا کے تخت کے ساتھ نشست لگائے بیٹھا ہے جیسا کہ اس کے پیروکاروں کو یقین ہے؟ وہ ہزاروں معصوم لوگ کہاں ہیں جنہیں جنوبی ہندوستان میں ہونے والے سکھ کش فسادات میں تہ تیغ کر ڈالا گیا یا جو بھوپال میں زہریلی گیس کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئے؟ ان زندہ رہ جانے والوں کا کیا بنا جنہوں نے ان جرائم کا ارتکاب کیا؟ یہ واضح ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی اس زمین پر سزا نہیں ملے گی جبکہ اس کے برعکس وہ سب آزاد ہیں' اور تو اور بہت سوں کے قبضے میں ابھی تک لوٹ کا مال ہے اور کچھ کے پاس اہم منصب موجود ہیں۔ کیا وہ مرنے کے بعد کیفر کردار کو پہنچیں گے؟

حتیٰ کہ مذاہب کے ہندومت خاندان (جین مت' بدھ مت اور سکھ مت) جو کہ جنت یا دوزخ کے جزا اور سزا کے مقامات ہونے کے تصورات کی تائید نہیں کرتے ہیں لیکن ''سمسکارا'' میں کبھی نہ ختم ہونے والے جنم' موت اور پھر سے جنم لینے کے چکر نے ان

مذاہب کو سورگ اور نرکھ کے تصورات کا شکار کر دیا ہے۔ اگرچہ دیومالائی حیثیت سے وہ اس جنم' موت اور پھر دوبارہ جنم کے عمل سے رہائی حاصل کرنے کے لیے ''موکش'' (بیڑا پار) کے تصور سے جڑے رہتے ہیں لیکن درحقیقت اس ''بیڑا پار'' ہونے سے مراد ''ویکنتھ'' (جہاں ان کی روحیں خدا میں گھل مل جاتی ہیں) کا حصول ہے۔

انصاف پسند سمجھے جانے والے خدا کے ہاتھوں ہونے والی بے انصافی کے المیے سے باہر نکلنے کے لیے مذہبی لوگ بل کھائی ہوئی منطق کے دل کھول کر ارمان پورے کرتے ہیں۔ ایتھوپیا میں پڑنے والے قحط کی وضاحت مدر ٹریسا ''جب تک اس سے تکلیف نہ ہونے لگے اس وقت تک خیرات دینے کا ایک موقع ہے'' کے طور پر کرتی ہیں۔ اگر وہ ٹھیک کہتی ہیں تو خدا ایتھوپیا کے بچوں کو بھوک سے مارتا ہے تاکہ زندہ لوگ خیرات کی رقم دے کر تکلیف محسوس کریں۔

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

عیسائیوں کو دائمی عذاب کے تصور سے تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ گناہ گار ترین کو بھی اپنے گناہوں کی تلافی کرنے اور معافی حاصل کرنے کا ایک موقع یقیناً ملنا چاہیے! جی ہاں' بالکل! وہ جواب دیتے ہیں۔ ''جز وقتی گناہ گار کے لیے مقامِ عرفات ہے جہاں اسے اس کے برے اعمال سے پاک کیا جاتا ہے اور اسے اتنا پاک صاف بنایا جاتا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو سکے۔'' ان خوشیوں میں سے ایک خوشی جس کا پاکبازوں سے مرنے کے بعد کی زندگی میں وعدہ کیا جاتا ہے' وہ گناہگاروں کو دی جانے والی اذیت کو دیکھنے کے لیے ایک خالی نشست کی فراہمی ہے۔ یہ سب بظاہر سرعام کوڑے لگانے' اذیت پہنچانے اور پھانسی دینے کی توجیہات ہیں جنہیں بہت سے لوگ اچھی تفریح گردانتے ہیں۔ عیسائی گناہوں کو دو درجوں میں تقسیم کرتے ہیں' وہ جن کی معافی مل سکتی ہے اور وہ جن کا انجام ناقابل اختتام سزا ہے۔ بائبل کہتی ہے۔ ''جب برا آدمی مرے گا تو اس کی توقعات فنا ہو جائیں گی اور بے انصاف شخص کی امید فنا ہو جاتی ہے۔'' (Book of Proverbs)۔ اس بیان میں محترم بیدی نے اضافہ کیا تھا: ''جب پاکباز آدمی مرتا ہے تو اس کی امیدیں فنا نہیں ہوتی ہیں۔''

لہٰذا مرنے کے بعد کی زندگی میں ایک جگہ ایسی ہے جو نہ تو جنت ہے اور نہ ہی دوزخ۔ اس جگہ آپ اعراف (Limbo) میں ہیں جیسے کہ کسی ریلوے اسٹیشن کی انتظار گاہ میں اپنی گاڑی کا انتظار کر رہے ہوں۔ پارسا لوگ جنت جانے کے لیے ایئر کنڈیشنڈ راجدھانی میں سوار ہوتے ہیں جبکہ نا قابل معافی لوگ دائمی عذاب کے لیے مویشی لے جانے والی گاڑی میں ہانک دیے جاتے ہیں۔ ایک تیسری قسم کی گاڑی بھی ہوتی ہے' ایک سست رفتار مسافر سوار گاڑی جو ہر اسٹیشن پر رکتی ہے جہاں چھوٹے گناہگاروں کو ان کے چھوٹے موٹے گناہوں سے پاک کیا جاتا ہے اور بالآخر یہ گاڑی بھی جنت میں پہنچ جاتی ہے۔

اسلام میں بھی درمیانی جگہ (پل صراط) کا تصور پایا جاتا ہے' یہ ایک قسم کے شک کا پل ہے جس پر سے آپ کو اپنی آخری منزل پر پہنچنے سے پہلے گزرنا پڑتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس پل کو محبت کے اظہار اور محبوب کے جواب کے درمیان پائے جانے والے بے یقینی کے دور کی طرح سمجھا ہے۔

پنجابی کے مشہور صوفی شاعر عنایت قادریؒ فرماتے ہیں:

پہلی پوڑی پریم دی
پل صراتے ڈیرہ
حاجی مکے حج کرن
میں مکھ دیکھاں تیرا
اے عنائیت قادریؒ
ہتھ پکڑیں میرا

جہاں تک میرا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے کہ ایک صاف ضمیر اس زمین پر زندگی کو جنت بنا دیتا ہے اور ایک مجرم ضمیر اس زندگی کو دوزخ بنا دیتا ہے میرے ایسا کہنے کی سند میرے فلسفی رہنما علامہ اقبال ہیں:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی' جہنم بھی!
یہ خاکی ہے' اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

❖ ○ ❖

سواستکا: ایک خوفناک علامت کی تاریخ

کپلنگ سوسائٹی کی جانب سے چھپنے والے رسالے ''دی کپلنگ جرنل'' جس کا میں بھی رکن ہوں کو کتابوں کی ایک دکان کے مالک نے جو کہ نایاب کتب کی خرید وفروخت کرتے ہیں ایک خط لکھا ہے۔ یہ خط رڈیارڈ کپلنگ کے اوائلی کام کے ایڈیشنوں پر چھپے سواستکا کے نشان کے متعلق ہے۔ یہ صاحب شکایت کرتے ہیں کہ گاہک اس نشان پر نازی علامت ہونے کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں جب تک کہ وہ انہیں وضاحت پیش نہیں کرتے کہ یہ ''گنیشا کا نشان'' ہے اور یہ کہ اسے ہٹلر کے اختیار کرنے کے بعد کپلنگ نے ترک کر دیا تھا۔

سواستکا کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں' ان میں سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ آریاؤں کا مخصوص نشان ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ چین' مصر' یونان' روم' میکسیکو اور پیرو میں بھی پایا گیا ہے۔ تاہم دوسری تہذیبوں میں اسے فراموش کر دیا گیا جبکہ ہندوؤں نے آج تک اس کو محفوظ کیے رکھا ہے۔ ہندو رسم میں ''اوم'' کا مقدس منتر پڑھتے ہوئے یہ لفظ بارہا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تین الفاظ کا مجموعہ ہے' ''سوا'' مطلب ''اچھا''۔ ''استی'' مطلب' ہے' اور ''کا'' جو اس کے نام کا اختتامیہ ہے۔ ملا کر پڑھا جائے تو سواستکا کا مطلب ہے ''یہ اچھا ہے'' لہٰذا اسے مبارک موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ مراقبے کے لیے اختیار کردہ یوگی حالت کو

سواستک آسن یا خوش قسمت حالت کیوں کہتے ہیں۔

نازی علامت کے مقابلے میں ہندو سواستکا کے بازو مخالف سمت میں ہیں۔

اگرچہ نازی طرز کے سواستکا ہندو مندروں اور گھروں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

میں یہ جاننے کا شائق تھا کہ کپلنگ نے اسے ''گنیتا کی علامت'' کیوں بیان کیا؟ کپلنگ بمبئی میں پیدا ہوا تھا۔ ایسا مون سون میں ہونے والے گنپتی کے میلے کے دوران ہوتا ہے کہ آپ کو عام دنوں کی نسبت سواستکا کے نشان زیادہ نظر آتے ہیں کیونکہ مہاراشٹر کی عورتیں اسے اپنے گھروں کے فرش پر بناتی ہیں اور اس کی پوجا کرتی ہیں۔

❖ ○ ❖

انسانی نفسیات' چاندنی اور جرائم

نفسیاتی امراض کے معالجین نے چاند کی بدلتی ہوئی حالتوں اور انسانی مزاج کے درمیان تعلق استوار کیا ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ چاند بڑھنے کے ساتھ ساتھ جرائم کا گراف بھی اوپر کی جانب بڑھنے لگتا ہے اور چاند کے کم ہونے پر یہ نیچے گرنے لگتا ہے۔ اس مشہور اعتقاد کے برعکس کہ چور اور ڈاکو ان راتوں میں واردات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جن میں چاند نہیں نکلتا ہے۔ دراصل یہ چودھویں کا چاند ہے جو برے آدمیوں میں پائی جانے والی برائی کو حرکت دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ محبت کرنے والوں کے دلوں میں محبت کے جذبات موجزن کرتا ہے۔ جرائم کے اعداد و شمار کے ماہرین نے چاندی جیسی چاند کی روشنی کے لیے انسانی تاثر کو نظرانداز کر دیا ہے۔ کسی شخص کی اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے محبوب کو بازوؤں میں بھر لینے کی خواہش کے علاوہ چاند کی چاندنی شراب نوشی کی اشتہا میں بھی اضافہ کر دیتی ہے۔ محبت اور شراب جذبات کو بھڑکاتے ہیں اور لوگوں کو غیر ذمہ دار بنا دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان دنوں کے اعداد و شمار اکٹھے کیے جائیں جب بارش برسانے والے کالے سیاہ بادل آسمانوں کو ڈھانپ لیتے ہیں اور مشرق سے بارشیں برسانے والی ہوائیں چلتی ہیں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ پینے کی اشتہا اور محبوب کو بازوؤں میں سمیٹ لینے کی خواہش کی وجہ سے شر پسند واقعات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مجھے شہنشاہ اکبر کی فارسی میں مرتب کی گئیں کچھ سطریں یاد آ رہی ہیں۔ وہ ان پڑھ تھا

اور اپنا نام تک لکھنا نہیں جانتا تھا' ان سطروں کی یقیناً اسے اچانک آمد ہوئی ہوگی اور اس کے کسی درباری نے اسے لکھ لیا ہوگا:

''پچھلی رات مے فروشوں کے کوچے میں
میں نے سونے کے بھاؤ ایک جام خریدا تھا۔
اب جبکہ میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے تو مجھے اس کا احساس ہوتا ہے کہ
میں نے سونے کے بھاؤ سر درد خریدا۔''

❖ ○ ❖

فحاشی کے خلاف جنگ کا بہترین طریقہ

یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ ہندوستان میں آپ کس قدر فحاشی کے باوجود بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور کس قدر معمولی سی بات پر آپ پولیس کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ایک زمانے میں ڈی ایچ لارنس کی کتاب ''لیڈی چیٹرلیز زالور'' پر سپریم کورٹ کی طرف سے فحش ہونے کی بنا پر پابندی لگا دی گئی تھی جیسا کہ پلے بوائے اور پینٹ ہاؤس جیسے رسالوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ لیکن کاما سوترا کے مکمل باتصویر تراجم اور ہندوستانی شہوانی آرٹ کے موضوع پر کتابیں جو پڑھنے والے کے تصور میں کوئی تاثر نہیں ابھار پاتی ہیں' انہیں ہر کوئی (تاہم بالغ) کسی بھی بک سٹور سے خرید سکتا ہے۔ فحاشی کے خلاف بنائے جانے والے قوانین کو ردی کی ٹوکری میں کیوں نہیں پھینکا جاتا ہے اور اس منافقت کو ختم کیوں نہیں کیا جاتا ہے؟

یہ تمہید مجھے فحاشی کے مطالعہ میں اضافے کی خاطر ملنے والی ایک کتاب کی طرف لے آتی ہے۔ میں نے اس کتاب کو خریدا نہیں تھا بلکہ اس کے مصنف جگ موہن کی جانب سے پہلے محدود ایڈیشن میں سے ایک دستخط شدہ کاپی مجھے پیش کی گئی تھی' میں سکون حاصل کرنے کے لیے فحش تحریریں پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہوں لیکن کاما کریدا (Sexistentialism) کے لیے 120 روپے نہیں خرچ سکتا ہوں۔ یہ بمبئی میں ہونے والے گروپ سیکس اور آپس میں بیویاں بدلنے کے متعلق لکھی گئی ہے۔ بھئی! میرا نہیں

خیال کہ یہ سب بمبئی یا ہندوستان کے کسی اور شہر میں ہوتا ہے۔ کم از کم میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ زنا کاری کا عام ہونا کافی ہے لیکن آپس میں بیویاں بدلنا اور پھر اسی کمرے میں ان کے ساتھ ہم بستری کرنا اخلاق سے گرا ہوا تصور ہے۔

200 صفحات پر مشتمل ''نویلا'' (Novella) کا مرکزی کردار سان فرانسسکو میں بسنے والا گوریلا گرو نامی ایک ہندوستانی شخص ہے۔ وہ اور ''اس کی عورت'' کا تعلق (4y's Club) سے ہے۔ یہاں مذہبی جوش و خروش کے ساتھ جنسی رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں اور روحانیت شدید جذبات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں مل کر اس کلب کی ایک شاخ بمبئی میں کھولتے ہیں جہاں اس کے بانی اراکین اپنے جسموں کو ''سریدان'' (بدن بخشیش) کے لیے پیش کرنے کا حلف اٹھاتے ہیں۔ میوزیکل چیئرز کی بجائے وہ ننگے ہو کر ناچتے ہیں اور اس قدرے بہتر زبان کی وجہ سے جس میں ان کی نازیبا حرکات کو بیان کیا گیا ہے، ساری صورتحال مکمل طور پر بے کیف ہو جاتی ہے۔ ''کاما کریدا'' مجھے قائل کرتی ہے کہ فحاشی کے خلاف جنگ لڑنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس پر کوئی توجہ نہ دی جائے۔ سنسر کر دینے، ضبط کر لینے، جرمانہ یا قید کی نسبت بوریت اسے زیادہ مؤثر انداز میں مار ڈالتی ہے۔

میرے پاس موجود اس کاپی کی تلاش میں آنے والی پولیس کی پیش بندی کے لیے میں نے اسے ایک دوست کو تحفے میں دے دیا ہے جو اسی قسم کا ذوق رکھتا ہے۔

''چوہدری'' بننے کا خبط

اس مرض کی شروعات ایک مخصوص نفسیاتی الجھن سے ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک خبط میں بدل جاتی ہے۔ ایک نفسیاتی الجھن کے طور پر یہ صورت حال کچھ نہ کچھ بننے کی جبلی خواہش کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے مثلاً ہر کمیٹی کا ایک رکن' اگر پہلے سے ہی اس کمیٹی کے رکن ہیں تو پھر اس کا خزانچی' نائب صدر یا صدر' ہر دعوت میں مرکز نگاہ ہونا ہر شادی میں دولہا نظر آنا اور ہر جنازے پر لاش تصور کیے جانا وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس خواہش کو اس وقت سختی سے لگام نہ ڈالی جائے جب یہ سر اٹھاتی ہے تو پھر یہ جلد ہی خبط میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔آپ اسے ہندوستان میں کسی وبائی مرض کی طرح پھیلا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ ہر دیہاتی سرپنچ' ہر سماجی کارکن ایک سیاستدان' ہر سیاستدان ایک ایم ایل اے یا ایم پی اور ہر ایم پی کابینہ کا وزیر یا وزیر اعظم بننا چاہتا ہے۔ ہر الیکشن میں ہزاروں آرزومند افراد کے مظاہر بھی کچھ مختلف نہیں ہیں۔

چوہدری بننے کی نفسیاتی الجھن خود کو زندگی کے کافی آغاز میں ظاہر کرتی ہے اور کالج جانے کی عمر کو پہنچنے تک خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔آپ یقیناً ایسے لڑکوں کو جانتے ہوں گے جو ہمیشہ کسی نہ کسی عہدے کے لیے منتخب ہونا چاہتے تھے ؛ کیپٹین کمیٹی کا رکن' کیرم کلب' یونیورسٹی یونین یا کسی بھی چیز کا صدر وغیرہ وغیرہ' اس کے بعد اسی طرح کے لوگ اپنے بیوپار منڈل میں کچھ نہ کچھ بننا چاہتے ہیں۔ FICCI روٹری کلب' لائنز کلب یا کسی بھی

دوسرے کلب میں کچھ نہ کچھ۔ وہ اپنے تعارفی کارڈوں اور دفتری کاغذوں کے ساتھ وہ فہرست منسلک کرتے ہیں جو وہ بننے میں کامیاب ہوئے ہوتے ہیں۔ میں ایک مسخرے کو جانتا تھا جس کے لیٹر پیڈ پر کاغذوں کے حاشیے میں اس کا مکمل تعارف چھپا ہوا تھا۔ وہ کالج میں سب سے بڑا جوکر تھا کیونکہ وہ ہر ٹیم کا کپتان بننا چاہتا تھا بعد میں وہ وزیر' گورنر اور سفیر کے عہدوں پر فائز رہا' پھر وہ لوگ ہیں جو ڈاکٹری کی اعزازی ڈگریاں ساتھ میں نتھی کرتے ہیں جیسے وہ انہیں طب یا ادب کے ماہر ہونے پر عطا کی گئیں تھیں۔ یہی حال سرکاری اعزازات کا ہے۔ قوانین موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ان سرکاری اعزازات کو تعظیمی القابات کی صورت میں ہرگز استعمال نہیں کیا جانا چاہیے اور انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد پر ذرا غور کیجئے جو خود کو پدما شری' پدما بھوشن وغیرہ وغیرہ بیان کرتے ہیں' چوہدری بننے کے خبط کی سب سے مضحکہ خیز مثال کلب الیکشنوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ادارہ جتنے زیادہ ممتاز لوگوں پر مشتمل ہوگا انفرادیت قائم کرنے کے لیے بیہودگی سے ہر کام میں ٹانگ اڑانے کا عمل بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ دہلی جم خانہ کلب کے حالیہ انتخابات کے دوران ووٹ توڑنے کے لیے کلب کے اراکین پر خطوط کی بھرمار کردی گئی تھی۔ تمام اراکین نے بلاتفریق امیدواروں کے عہدوں کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کردیئے تھے' ان عہدوں میں IAS' IPS' IFC اور سکوارڈن لیڈر وغیرہ شامل تھے اس سے بھی زیادہ مرعوب کن پہلو یہ تھا کہ ایسے کلب میں جس کے آدھے سے زیادہ اراکین کاروباری شخصیات' چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہوں۔ وہاں امیدواروں کے ناموں کے ساتھ انڈین ریونیو سروس یا کمشنر آف انکم ٹیکس کے عہدوں کے دم چھلے لگے ہوئے تھے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کے یہ عہدے بیلٹ پیپر پر بھی درج تھے۔

ان جوکروں کو چوہدری بن کر کیا حاصل ہوتا ہے؟ اگر پیسے نہیں تو کیا عزت ملتی ہے؟ (اگرچہ کچھ لوگ تھوڑے بہت پیسے ہڑپ کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے ہیں) اور مخصوص دورانیے کے لیے عملے کی جی حضوری حاصل ہوتی ہے۔ برتن چھوٹا ہو تو اس میں ڈالی گئی چیز بھی تھوڑی ہی ہوتی ہے!

❖ ○ ❖

خاندانی منصوبہ بندی

میرے سامنے ماہنامہ ''آرٹ آف لیونگ'' میں چھپا ایک اشتہار پڑا ہوا ہے جسے پنجاب حکومت کے صحت وخاندانی بہبود کے ڈائریکٹر نے جاری کیا ہے چونکہ شمارہ فن اور ادب کے لیے مختص ہے اس لیے محکمے کو اس شمارے کے شایان شان اشتہار تیار کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس کے باوجود یہ نہایت مضحکہ خیز ہے۔ سرخی کچھ اس طرح ہے ''بے رحم خوبصورت مالکن'' اس کے لکھنے والے نے یقیناً ''لا بیلے ڈیم سینس مرکی La Belle Dam Sans Merci'' نامی نظم کا مطلب ہضم کیے بغیر پڑھی ہوئی تھی۔ بے رحم مالکن ایک استانی کے گھر پہنچتی ہے جس کا اس گاؤں میں حال ہی میں تبادلہ ہوا ہے۔

''بچوں کی تعداد؟'' غصے میں کھولتی ہوئی مالکن پوچھتی ہے۔ استانی تین ماہ کے ایک بچے کی ماں ہونے کا اعتراف کرتی ہے۔

''کیا گارنٹی ہے کہ تم ان کی تعداد میں جلد اضافہ نہیں کرو گی؟ تم سے پہلے میرا گھر ایک فٹ بال کی ٹیم جتنے بڑے کنبے نے خراب کر دیا تھا اور بے چارے والدین میں تو کرایہ دینے کی بھی سکت نہ تھی۔ مجھے گھر خالی کروانے کے لیے دو سال کا کرایہ چھوڑنا پڑا تھا!'' بے چاری استانی باقاعدگی سے کرایہ ادا کرنے کا وعدہ کرتی ہے۔ بے رحم مالکن اس کے معاملے پر ہمدردانہ غور کرنے کے لیے رضامند ہو جاتی ہے بشرطیکہ استانی تبھی

(Copper) ڈلوالیتی ہے اوراس کے سو فیصد مؤثر ہونے کی ذمہ داری قبول کر لیتی ہے۔ بظاہر استانی کے پیٹ میں پہلے ہی دوسرا بچہ دکھائی دے رہا ہوتا ہے۔ ''پھر تو یہاں نزدیک ہی واقع بنیادی مرکزِ صحت سے ابارشن کروالو کیا تمہیں یہ منظور ہے؟''

استانی مان جاتی ہے۔ وہ Tubectomy کے عمل سے نہ گزرنے کے لیے بھی رضامند ہو جاتی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے جب سے میں نے Tubectomy کے لیے اپنی لیپر وسکوپی کروائی تھی میرا مرد زیادہ اطاعت شعار بن گیا تھا مالکن اپنے شوہر کو گواہی دینے کے لیے بھلا بھیجتی ہے۔ اس کا شوہر اپنی شکر گزاری کو تسلیم کرتا ہے: ''بہر حال تم ایک بڑے آپریشن سے گزری تھیں جبکہ میں نے ایک چھوٹے سے آپریشن سے احتراز کیا تھا لہٰذا مجھے لازماً تمہاری عزت کرنی چاہیے بھلا یہ کوئی زن مریدی ہے؟'' وہ سوالیہ انداز میں کہتا ہے۔

کیا آپ کو بات سمجھ میں آئی؟ لگتا ہے پنجابیوں کو تو آ گئی ہے۔

کوا چلا ہنس کی چال

دہلی میں کانگریس کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے پارٹی عہدیداران کو تار بھجوائے گئے تھے۔ انگریزی زبان سے ناآشنا تار بھجوانے والے کچھ کلرکوں نے لفظ Centenary (صد سالہ) کو Sanitary (پانی کے نکاس کا نظام) میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس لفظ کو ایک اور انداز سے پرکاش پٹیل نے استعمال کیا تھا جو اس وقت مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ وسنت دادا پٹیل کے صاحبزادے ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آیا ان کے والد واقعی راجیو گاندھی سے ملے تھے اس پر انہوں نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا: ''جی ہاں Century (سودیں) تقریبات کے موقع پر۔'' پھر پارلیمنٹ کے ایک رکن تھے جو بجٹ پر تقریر کرنے کے بعد لفظ بہ لفظ نقل کی گئی تقریر کے مسودے میں سے غلطیاں درست کر رہے تھے۔ وہ غصے میں آ کر پھٹ پڑے! ''جو لوگ ہماری پارلیمنٹ کی کارروائی تیار کرتے ہیں سیدھے سادے لفظوں کو غلط لکھ دیتے ہیں' میں بجٹ (Baajet) پر بات کر رہا تھا اور انہوں نے ایک بار نہیں ہر بار اس کی نقل میں بجٹ (Budget) لکھا ہے۔

❖ O ❖

بدلتا ہوا بمبئی

ہر بار جب میں بمبئی آتا ہوں تو یہ بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے پر ہجوم تھا جبکہ اب یہ پہلے سے بھی زیادہ گنجان آباد ہو گیا ہے۔ یہ ہمیشہ سے گندہ تھا اور اب مزید گندہ ہو گیا ہے۔ یہ ہمیشہ کا بدبودار تھا لیکن اب متعفن ہو چکا ہے۔ مون سون کی بارشیں تیرتے ہوئے گندے پانی کو گٹروں میں بہالے جاتی ہیں اور آپ کچھ دیر کے لیے سمندر کی تازہ ہوا میں سانس لے سکتے ہیں۔ جب سورج نکلتا ہے تو شہر کے ان گنت مکین اپنے چیونٹیوں کے گھروندوں جیسے کئی منزلہ گھروں سے باہر نکلنے لگتے ہیں اور جلد ہی ہر گلی رینگتے ہوئے انسانی کیڑوں کے مضطرب ہجوم میں تبدیل ہو جاتی ہے یا پھر ایسا صرف آدھ کلومیٹر تک آسمان میں پرندوں کے مچان کی مانند بلند ائیر کنڈیشنڈ گھروں کی کھڑکیوں میں سے دکھائی دیتا ہے' جہاں سے امیر طبقے کے لوگ انسانی ہاتھوں سے تعمیر کردہ شیشے اور سیمنٹ کے بنے اس اجنبی جنگل پر نگاہ دوڑاتے ہیں۔ شیوسینا چی بال ٹھاکرے اور سابق مہاراشٹر چی دادا پٹیل کا کہنا درست ہے کہ بمبئی میں رہنے والوں کی تعداد اس شہر کی گنجائش سے کہیں زیادہ ہے۔ انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ ان مکینوں میں سے بیشتر کا تعلق مہاراشٹر سے ہے۔

میں ''Mid-Day'' (اخبار کا نام) کی چھٹی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کے لیے بمبئی میں ہی تھا۔ اس اخبار کے مالک و مدیر خالد انصاری کی جانب سے دی جانے والی لاتعداد دعوتوں کے موقع پر میں نے گننے کی کوشش کی کہ ان کے کتنے مہمان ''بمبئی کے بیٹے''

ہونے یا ''زبان'' کا امتحان پاس کرسکتے ہیں جس کی دہائی اکثر'' مہاراشٹر مہاراشٹر والوں کا ہے'' جیسے نقطۂ نظر کے حامی پراپیگنڈہ کرنے والے دیا کرتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر' جیسا کہ پارسی مہمان' رسی کرنجیا (Blitz) ان کے بھائی برجور (Screen) اور گلشن ایونگ (Eve,s weekly) وغیرہ بمبئی کی پیدائش رکھتے ہیں۔ یہ لوگ تھوڑی بہت مراٹھی سمجھتے ہیں لیکن کیا وہ مراٹھی اتنی اچھی بول سکتے ہیں کہ وہ اس زبان کا ابتدائی امتحان پاس کرسکتے ہوں؟ اس بارے میں مجھے شک ہے۔ باقی مہمانوں میں سے زیادہ تر بمبئی کے محض مکین تھے جن کا مراٹھی زبان کا ذخیرہ الفاظ بمشکل '' گن پتی باپا'' چلانے سے زیادہ تھا۔

جب ہمارے تمام بڑے شہر نہایت خستہ حال اور گنجان آباد ہیں تو میں صرف بمبئی ہی کا انتخاب کیوں کرتا ہوں؟ اور پھر یہ کہ ان تمام شہروں میں باہر سے آکر بسنے والے لوگ ان لوگوں کی نسبت جن کی جڑیں یہاں زیادہ گہری ہیں کیوں بہتر کام کر رہے ہیں؟ بمبئی کا ذکر خاص طور پر کرنے کی صرف ایک وجہ ہے کہ شہروں کی ضرورت سے زیادہ بڑھتی ہوئی آبادی ایک قومی مظہر ہے جس سے قومی سطح پر نبرد آزما ہوا جانا چاہیے۔ سیاستدانوں کو بہتر طور پر معلوم ہونا چاہیے کہ بمبئی وہ واحد شہر ہے جہاں پر وہ سب تنگ نظر جذبات کو ہوا دے کر اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بات ان کے علم میں ہونی چاہیے کہ علاقائی تفاخر کی طرف توجہ مبذول کروانا ملک میں خطرناک حد تک سرایت کرسکتا ہے۔ اگر آج بمبئی کو چھینک آتی ہے تو کل کو دوسرے شہر سردی کی وجہ سے بیمار پڑ سکتے ہیں۔

❖ ○ ❖

ایک نیتا کی کہانی

میں نے چار وجوہات کی بنا پر جان بوجھ کر نقصان پہنچانے کی نیت سے یہ کہانی لکھی ہے۔ یہ سچی کہانی ہے' یہ ہمارے لوگوں میں کامیابی کو ہضم کرنے کی نااہلیت کو بیان کرتی ہے۔ یہ نودولتیوں کی اکڑ کے خلاف عام آدمی کے ردعمل کو بیان کرتی ہے اور اس کے اختتام میں ایک اخلاقی سبق ملتا ہے۔ میں نے کسی کا نام نہیں لیا ہے کیونکہ میں متاثر ہونے والے اور جھوٹے افراد کی وجہ سے پہلے ہی کافی مصیبت کا سامنا کر چکا ہوں۔ جنہوں نے مجھے پورے ملک کی پریس کونسلوں اور عدالتوں میں گھسیٹا تھا۔ مسخروں کی وہ ٹوپیاں جو میں نے اس کہانی میں بلند کی ہیں وہ بہت سے بیوقوفوں کے سر پر پوری آئیں گی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ایک شخص نے مشہور شخصیت بننے کے لیے اپنی زندگی کی گاڑی کو جھٹکے سے ترقی کی شاہراہ پر ڈالا۔ پارٹی کے جلوس کی قیادت کرنے والی گاڑی پر اسے جونہی وہ خالی نشست ملی جو کہ ماضی میں مسلسل کامیاب نشست چلی آ رہی تھی اس کے نصیب جاگ اٹھے۔ اس نے اپنی واجب الادا رقم کا تقاضا کیا اور وہ اسے مل گئی یعنی اس نے خود کو پارلیمنٹ کا رکن پایا۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ ہندوستان اس کی کستورا مچھلی تھی (سے اڈلی دوسا ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ سبزی خور واقع ہوا تھا) اس کی شخصیت غیر معمولی تبدیلی کے عمل سے گزری تھی۔ ہمیشہ ہاتھ باندھ کر ہر ایک کی جی حضوری کرنے والا اب لوگوں سے حقارت آمیز لہجے میں بات کرنے لگا تھا اور اس کی جی حضوری صرف ان لوگوں

کے لیے رہ گئی تھی جن سے اسے بہتر عہدے یا روپے مل سکتے تھے۔ اگر آپ اسے پارلیمنٹ کا رکن بننے سے پہلے کا جانتے تھے تو پھر آپ کے لیے اسے پارلیمنٹ کا رکن بننے کے بعد پہچاننا مشکل تھا۔

ایک خوشگوار صبح اس نے اپنے دولت مند دوستوں میں سے ایک کو ملنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ملاقات کافی کے ایک کپ کے لیے تھی یا اس کا کچھ اور مقصد تھا ہم کبھی بھی یہ راز جان نہیں پائیں گے۔ ان دولت مند صاحب نے' جنہیں بے انتہا دولت کے مالک ''کامادینو' کی طرح باقاعدگی سے دودھ دوہنے کی عادت تھی' اپنے کئی منزلہ دفتر کے گرد اچھا خاصا حفاظتی بندوبست کر رکھا تھا۔ اسے ہمارے پارلیمانی رکن کی بدقسمتی کہہ لیجیے کہ دفتر کے صدر دروازے پر موجود چیف سیکورٹی گارڈ ہریانے کا جٹ تھا۔ وہ لوگ جو ہریانے کے جٹوں کو جانتے ہیں اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ان میں سے کسی کے بھی ساتھ بحث نہ کرنا ہی دانشمندی ہے کیونکہ وہ پنجابی جٹوں کی نسبت زیادہ بدمزاج ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمارے دوست پارلیمان کے رکن کو یا تو معلوم نہیں تھا کہ ہریانے کے جٹ کس مٹی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں یا پھر وہ وردی میں ملبوس جوان کی ذات کو پہچاننے میں ناکام ہو گئے تھے۔

قصہ مختصر' ایم پی (ممبر پارلیمنٹ) صاحب اپنی نئی ایئر کنڈیشنڈ کار سے نیچے اترے اور لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے کئی منزلہ عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔ ہریانے کے رہنے والے نے اپنا ہاتھ نکالا اور انہیں استقبالیہ پر پاس حاصل کرنے کے لیے کہا۔ انہوں نے ہریانوی کو بدتمیزی سے ایک طرف دھکیلا اور لفٹ کی جانب بڑھ گئے۔ ہریانوی انہیں روکنے کے لیے ان کے پیچھے دوڑا۔ ایم پی صاحب غرائے ''تو جانتا نہیں میں کون ہوں؟'' اور اسے الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ رسید کیا' جس نے ہریانوی کی ٹوپی کو زمین پر گرا دیا۔ اپنے دولت مند دوست کے ساتھ آدھ گھنٹہ گزارنے اور کافی کا کپ پینے کے بعد یا جس کسی بھی مقصد کے لیے وہ اپنے ''کامادینو'' کو ملنے آیا تھا' اس سے فراغت پا کر ایم پی صاحب سیکورٹی گارڈ کی طرف سے معذرت کرنے اور قدرے نرم رویہ اختیار کرنے کی توقع لیے لفٹ سے نیچے اترے۔ گارڈ چشم براہ تھا۔ اس وقت تک اسے یہ بھی

معلوم ہو چکا تھا کہ یہ وی آئی پی ملاقاتی کون تھا۔ اپنے تمام ساتھیوں اور استقبالیہ کمرے میں انتظار کرنے والے دوسرے ملاقاتیوں کے سامنے اس گارڈ نے ایم پی صاحب کے منہ پر ایسا تھپڑ رسید کیا جس سے نہ صرف ایم پی صاحب کا چشمہ گر گیا بلکہ وہ خود بھی لڑکھڑاتے ہوئے فرش پر جا پڑے۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں تو اگلی مرتبہ آپ خود ہریانے کے کسی جٹ سے ٹکرایئے اور اسے تھپڑ کھانے کے لیے طیش دلایئے' پھر آپ کو سمجھ آ جائے گا کہ میرے کہنے کا کیا مطلب ہے؟

اس قصے سے چند اخلاقی سبق حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا' کامیابی کو ہضم کرنے سے زیادہ مشکل کام اور کوئی نہیں ہے۔ یہ نہ صرف معدے میں گیس پیدا کرتی ہے بلکہ یہ آپ کا دماغ بھی خراب کر دیتی ہے۔ دوسرا' مغرور آدمی سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا حتیٰ کہ اس کی بیوی اور بچے اور یہاں تک کہ ایرے غیرے بھی جو وی آئی پی کے کروڑ کو ٹکے کی اہمیت بھی نہیں دیتے ہیں اور آخری بات یہ کہ جب آپ کسی ہریانے کے رہنے والے سے ٹکرائیں تو حفظ ماتقدم کے طور پر اسے اس طرح مخاطب کریں جیسے آپ چوہدری چرن سنگھ کو کرتے ہیں ''رام' رام چوہدری جی'' یا پھر چہرے پر ہیلمٹ پہن لیں۔

اصطلاحیں نہیں ذہن بدلو!

مستقبل میں ترتیب بالکل الٹ ہو جائے گی۔ توقع ہے کہ آئندہ سے خطوط کا ابتدائیہ "Dear Sir or Madam" کی بجائے "Dear Madam or Sir" پڑھا جائے گا ورنہ آپ پر مساوات نسواں کے مخالف ہونے کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ یہ رائے لندن کی ہیکنی کونسل (Haekney Council) کی خواتین کے لیے مساوی مواقع کی کمیٹی کی ہے۔ یہ مردوں کو خواتین کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ کے چناؤ میں مزید احتیاط برتنے کی تنبیہ کرتی ہے۔ خواتین کے متعلق لکھنے سے پہلے انہیں سوچ لینا چاہیے کہ کہیں انہیں نکما یا بے کار تو ظاہر نہیں کیا جا رہا ہے یا کہیں انہیں نظر انداز یا گھسے پٹے الفاظ سے تو مخاطب نہیں کیا گیا ہے اور سب سے اہم یہ کہ کہیں ان کا مذاق تو نہیں اڑایا گیا ہے؟ ایسے الفاظ جنہیں مونث میں تبدیل کرنے پر نسوانی طبقے کے احساسات مجروح ہو سکتے ہیں ان کے نمونے حسب ذیل ہیں:

Dust man کو Dustwomen نہیں لکھا جانا چاہیے۔ فورمین کو فوروومین کی بجائے "سپروائزر" لکھیں تو زیادہ مناسب ہے اور ہاؤس وائف کے لیے Consumar Shoppor زیادہ موزوں لفظ ہے۔ معذور افراد کے لیے بھی اسی طرح کی لفظی تبدیلیاں تجویز کی گئیں ہیں مثلاً جسے دکھائی نہیں دیتا ہے اسے "اندھا" کہنے کی بجائے بصارت سے محروم کہا جائے اور اگر وہ خاتون یا صاحب ایک آنکھ سے دیکھ

سکتے ہیں تو انہیں ''محدود بصارت سے محروم'' کہا جائے۔

شیکسپیئر کے زمانے میں ایک موچی کو ''انسانی جوتوں کے سرجن'' کے عہدے پر ترقی دے دی گئی تھی۔ آج کے دور میں، میں ایک ایسے باروچی، دھوبی اور خاکروب کو جانتا ہوں جنہیں بالترتیب کیٹرنگ افسر، لانڈری مین اور ڈسٹ مین کے عہدے دیئے گئے ہیں۔ اصطلاحات میں کی جانے والی تبدیلی کس طرح پیشے کی قباحت میں تبدیلی یا محروم لوگوں کے جذبات میں کمی لاسکتی ہے۔

جانوروں کی چھٹی حس

چند ہفتے پہلے میں نے اپنے ایک کالم میں اس پراسرار چھٹی حس کا ذکر کیا تھا جو کچھ جانوروں' پرندوں اور کیڑے مکوڑوں میں پائی جاتی ہے مثلاً گدھ کی کئی میل دور سے لاش کو تاڑ لینے کی صلاحیت' کتے کی کسی سوٹ کیس کی تہہ میں چھپائی گئی منشیات کو سونگھ لینے کی صلاحیت وغیرہ وغیرہ۔ نانک پور (دہلی) کے رہنے والے ایم۔ ایل آہوجہ ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں جو پریت نگر (پاکستان کے ساتھ ملحقہ ہماری سرحد کے پاس) کے بانی اور ''پریت لڑی'' کے مدیر سردار گربخش سنگھ مرحوم کی لکھی ہوئی خودنوشت میں سے لیا گیا ہے۔ وہ 1935ء میں زلزلے کے ہاتھوں تباہ ہونے والے شہر (کوئٹہ) کے اسٹیشن ماسٹر کے متعلق لکھتے ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب آخری گاڑی کو جاتا ہوا دیکھنے کے بعد رات دیر سے گھر لوٹے تھے۔ وہ تھکے ہوئے تھے اور سونا چاہتے تھے لیکن ان کے کتے نے انہیں ان کے پاجامے سے پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا گھر سے باہر لے گیا۔ چند ہی لمحوں بعد زمین ہلنے لگی۔ کوئٹہ کا بیشتر حصہ ملبے میں تبدیل ہو گیا اور ہزاروں سوئے ہوئے افراد ملبے کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے۔ اسٹیشن ماسٹر اور ان کا کتا چند بچ جانے والوں میں سے تھے۔

سمیرون سرکار نے مجھے ایک اور واقعہ لکھ کر بھیجا ہے جو لال بازار پولیس اسٹیشن کے سامنے واقع اپارٹمنٹس کے ایک بلاک میں رہنے والی ایک بلی کے متعلق ہے۔ اس بلی کے چار بھورے چھوٹے بچے تھے۔ بچوں کو جنم دینے کے چند دن بعد اس بلی نے برابر

والے بلاک میں واقع ایک مہربان خاتون کے زیر استعمال فلیٹ کو تاڑ لیا۔ پھر ایک ایک کر کے اس نے اپنے بچوں کو گردن سے اٹھا کر اُس خاتون کے بیڈروم کے ایک کونے میں پہنچا دیا۔ اس عمارت میں اسی رات آگ لگ گئی اور اس نے اُس کے کمرے کو تباہ کر دیا جہاں بلی نے بچوں کو جنم دیا تھا۔ کلکتہ کے تمام اخبارات میں اس واقعہ کے متعلق لکھا گیا تھا۔

مذہب وسیاست کی یکائی کے مضمرات

پنجاب کی نئی اکالی حکومت کی کابینہ کے وزیروں نے چندی گڑھ میں حلف اٹھانے کے بعد پہلا کام جو سرانجام دیا وہ امرتسر میں گولڈن ٹیمپل پر جا کر شکرانہ ادا کرنا تھا۔اس کے بعد نیک شگون کے لیے امریندر سنگھ اپنی مہارانی صاحبہ اور اکالی ٹکٹ پر منتخب ہونے والے دو ایم۔ایل اے صاحبان (ایک ہندو اور ایک سکھ) کے ہمراہ مہاکالی کے سامنے ماتھا ٹیکنے کے لیے پٹیالہ روانہ ہو گئے۔آیا ان میں سے کسی نے کسی درگاہ پر کسی مسلمان صوفی کی قبر کو بھی سلامی دی تھی یا چرچ میں کسی پادری سے دعائیں بھی وصول کی تھیں'اس کا ہمیں علم نہیں ہے۔

''اُن کے ایسا کرنے میں کیا برائی ہے؟''میرے دوست نہایت غصے سے پوچھتے ہیں۔''جب کبھی بھی صدر'وزیراعظم'وزیراعلیٰ یا کوئی بھی ریاستی افسر کسی عبادت گاہ میں جاتا ہے تو تمہیں اتنی تکلیف کیوں ہوتی ہے؟ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔''

بالکل ٹھیک! کیونکہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے تو پھر عوامی زندگی گزارنے والے اشخاص کو مذہبیت کے عوامی مظاہروں سے اجتناب کرنا چاہیے۔میں جواباً کہتا ہوں! ''اگر یہ حضرات اپنے ساتھ پریس کے فوٹو گرافروں اور صحافیوں کا جتھا لے جائے بغیر اپنے گھروں یا مندروں میں اپنے دیوتاؤں کی نوازشات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔لیکن اس نمائش کا مقصد اشتہار بازی ہے یعنی اس بات کی تشہیر کرنا کہ کیونکہ وہ مذہبی رجحان رکھتے ہیں اس لیے وہ ایماندار اور خوف خدا رکھنے والے

لوگ ہیں۔ اگر وہ دوسری مذہبی عبادت گاہوں میں بھی جاتے ہیں تو یہ سرب دھرم سمبھاو (تمام مذاہب کا احترام) نہیں ہے بلکہ یہ اس بات کا مظہر ہے کہ وہ تنگ نظر نہیں ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آئندہ الیکشنوں میں یہ نمائش ان کو ملنے والے ووٹوں کی تعداد میں اضافے کو یقینی بنائے گی۔'' جس طرح مکے حج پر جا کر یا گنگا میں نہانے سے پچھلے گناہ دھل نہیں جاتے ہیں اسی طرح عبادت گاہ میں جانے سے کوئی شخص معتبر نہیں ہو جاتا ہے۔ نہ ہی یوم سبت کو گرجے میں حاضر ہونا کسی اسفنج کی طرح کام کرتا ہے جو پچھلے چھ دنوں کے گناہ دھو ڈالے۔ کیا خوب کہا گیا ہے۔

''عیسائی وہ ہے جو ہفتہ کو کیے گئے اور پیر کو کیے جانے والے گناہ پر اتوار کے روز پچھتاوے کا مظاہرہ کرتا ہے۔''

جب مشہور سیاسی شخصیات اپنی مذہبی وابستگی کو جان بوجھ کر کیے جانے والے تشہیری عمل میں ڈھالتی ہیں تو وہ لوگ کیا کہنا چاہتے ہیں جو مذہب کو سیاست سے علیحدہ کرنے کی دہائی دیتے ہیں۔

جنت نظیر

میں نے ماؤنٹ ابو(Mount Abu) کو پچاس سال پہلے دریافت کیا تھا۔ اس وقت میں ہرٹ فورڈ شائر کے ایک گاؤں میں مقیم تھا۔ ہر صبح جب میں کالج کے لیے ٹرین میں سوار ہونے کے لیے اسٹیشن پہنچتا تھا تو میری نظر سے ایک قد آور رنگین پوسٹر گزرا کرتا تھا جس میں بھورے گرینائٹ کی چٹان میں گڑے ہوئے سنگ مرمر کے مندر کی تصویر بھی موجود تھی۔ یہ پوسٹر کچھ یوں پڑھا جاتا تھا: ''ہندوستان کی سیر کیجئے' دلوارا کے مندر' ماؤنٹ ابو۔'' ہر دوسرے دن میرا کوئی ساتھی مسافر یا کوئی اور مجھ سے پوچھنے لگتا ''سنگھ' کیا تم اس جگہ کے بارے میں جانتے ہو؟'' مجھے تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ یہ جگہ ہندوستان کے نقشے میں کہاں واقع تھی مجھے بالکل معلوم نہیں تھا لیکن وطن واپس لوٹنے کے بعد پہلا کام جو میں کرسکتا تھا وہ اس جگہ کی سیر تھی۔ لہٰذا میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے اپنے زیر تکمیل معاشقے کو پایہ تکمیل پر پہنچانے کے لیے ماؤنٹ ابو کا انتخاب کیا۔ یہ نومبر 1939ء کی بات ہے۔

ایک ایسے بنگلے میں جہاں سے جھیل نکی دکھائی دیتی تھی گزارے جانے والے یہ انتہائی پرمسرت تین ہفتے تھے۔ ہم دونوں اپنی صبحیں چپو والی کشتی میں اود بلاؤ کے جوڑے کا پیچھا کرتے ہوئے گزارتے تھے۔ جبکہ ہماری شامیں گھنے جنگلوں سے ڈھکے پہاڑی مقامات کو کھوجنے اور بڑے بڑے پتھروں کی تہہ میں سے اگتے ہوئے برگد کے قدیم

درختوں کی اوٹ میں لنگوروں کو رنگ رلیاں مناتے ہوئے دیکھنے کے لیے مختص تھیں۔ ہم کئی بار دلوارا کے مندروں کی سیر کے لیے گئے تھے۔ سنگ مرمر کی اس سے شاندار کاریگری دنیا میں کہیں اور نہیں پائی جاتی ہے۔ ہم اپنے پاؤں تلے پھیلے ہوئے راجستھان کے صحرا کا نظارہ کرنے کے لیے پہاڑی سلسلے کے کنارے پر واقع ایک ایسے خاص مقام پر گئے جس کا نام ایک ایسے پارسی جوان کے نام سے منسوب ہے جسے محبت کی سولی پر چڑھانے کے لیے جہانگیر فالز کے مقام پر موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ ہم ایک ایسی جگہ پر بھی گئے جہاں پر ہم سے پہلے کسی نے سورج ڈوبنے کا نظارہ نہیں کیا تھا۔ ہم چاندنی میں جھلمل کرتی ہوئی نکی جھیل کو دیکھنے کے لیے واپس اپنے بنگلے میں لوٹ آیا کرتے تھے اور گیند نما دو پہاڑی چوٹیوں کو اپنے نام دیا کرتے تھے جو بھیل قوم کی دیو مالائی داستانوں سے تعلق رکھنے والی طویل قامت جننی کی چھاتیوں جیسی دکھائی دیتی تھیں۔ وہاں جنگلی حیات کی بھی بہتات تھی' کئی قسموں کے ہرن' ریچھ اور جنگلی سور پائے جاتے تھے۔ چیتے خرگوشوں کو پکڑنے کے لیے بنگلوں میں گھس جایا کرتے تھے۔ ایک چیتے کو تو ایک اینگلو انڈین لڑکے نے جو چھٹیاں گزارنے آیا تھا ہمارے بنگلے سے بمشکل 100 گز کی دوری پر مار گرایا تھا۔ اس وقت ابو ایک ہزار سے کم مکینوں پر مشتمل ایک ایسی چوٹی تھی جو جنگل میں گھری ہوئی امن وسکون کی جنت لگتی تھی۔

پچھلے ہفتے میں دوبارہ ماؤنٹ ابو گیا تھا۔ گزرنے والے سال ابو کے لیے خاموشی اور سکون کی بجائے ہجوم اور بازاری پن کا فروغ لے کر آئے تھے۔ اس کی آبادی پہلے سے پندرہ گنا بڑھ گئی ہے اور ہر موسم گرما میں یہاں سیر کے لیے آنے والوں کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ شہزادے' جن کی نظارہ پرور جگہوں پر رہائش گاہیں تھیں' عرصہ دراز سے انہیں خالی کر چکے ہیں۔ کچھ رہائش گاہوں کو جیسا کہ جے پور ہاؤس جہاں سے شہر دکھائی دیتا ہے' چار کمروں پر مشتمل' ٹوٹی ہوئی میزوں' شکن آلود پردوں' قالینوں اور صوفوں سے آراستہ ہوٹلوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ برہما کماری برادری کے تروید نے مجھے ایک چھوٹا سا غار دکھایا جس کے نیچے شیوا کا معبد ہے جہاں سنگ مرمر کا ایک ایسا کتبہ نصب ہے جس پر درج ہے کہ اسے 1867ء میں موتی لال وکیل نے عطیہ کیا تھا۔ کیا یہ

موتی لال نہرو تھے؟ کسی نے یہ جاننے کی اب تک زحمت گوارہ نہیں کی ہے۔ ماؤنٹ ابو کا شاہانہ انداز کا ماحول گجراتی بھیل پوری پاؤ بھاجی کلچر کا شکار ہو چکا ہے۔ کھانے پینے کے اسٹالوں کی قطاریں اور کباڑ کی ایسی دکانیں جنہیں لوگ غلطی سے آرٹ اور دست کاری کا مرکز سمجھ لیتے ہیں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔

چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کی تعداد 70 سے زیادہ ہے جن میں سے بیشتر خالص ویجی ٹیرین فوڈ کی شیخی بگھارتے ہیں (ناخالص ویجی ٹیرین فوڈ کیا ہوتا ہے؟)

نصف درجن کے قریب تھری سٹار ہوٹل بھی ہیں جن کے ناموں سے ناواقف لوگوں کو پھنسانے کے لیے نہایت چالاکی سے حروف تہجی کا ہیر پھیر کیا گیا ہے' جیسے Hilton کی بجائے Hilltone' Sheraton کی بجائے Sherratone یعنی پوری چار سو بیسی نہیں بلکہ اس کے قریب قریب۔ پان سگریٹ کے ہر اسٹال سے اونچی آواز میں فلمی موسیقی جاری ہے۔ یہاں بسوں اور کاروں نے سڑکوں پر ٹریفک بھی روک رکھی ہے۔ ہر شام جیبی ٹرانزسٹروں سے مسلح ہو کر بہت سا ہجوم ''سن سیٹ پوائنٹ'' پر جمع ہو جاتا ہے۔ جس منظر کو خاموشی کے ساتھ دیکھنا چاہیے اسے شور اور چلا کر پیدا کیے گئے ناگوار بے سرے پن کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

وہ واحد مقام جہاں پرانا اطمینان وسکون باقی ہے دِلوارا میں واقع جین مت کے قدیم مندر اور برھم کماری کا نیا آشرم ہے۔ ایک میں مہاویرا کی روح اور دوسرے میں دادا لکھ راج کی روح اور ان لوگوں کی مخصوص لہجے میں پڑھی جانے والی دعا اوم شانتی رچی بسی ہوئی ہے۔ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے نہایت خوبصورت پہاڑی مقامات میں سے ایک کو قتل ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

❖ O ❖

ناکام ہندوستانی عشاق

چند دن پہلے مجھے ایک ڈچ لڑکی کا خط موصول ہوا۔ روایت کے برخلاف یہ خط اس نے نہایت صاف گوئی سے اپنی نجی زندگی کے بارے میں لکھا تھا۔ وہ ایک ہندوستانی لڑکے کی محبت میں مبتلا رہ چکی تھی۔ وہ دونوں دو سال تک اکٹھے رہتے رہے تھے اور شادی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ پھر ہندوستانی لڑکا کچھ بتائے بغیر چلا گیا اور اس نے اپنے ہی رشتہ داروں میں سے ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جسے اس کی ماں نے چنا تھا نہایت فرمانبرداری کے ساتھ شادی کر لی۔ میں محبت میں مبتلا ایسے لاتعداد ہندوستانی لڑکوں کو جانتا ہوں جو شادی کی بات آنے پر اپنی محبوباؤں کو صرف اس لیے مایوس کر دیتے ہیں کہ ''ممی نہیں مانتی ہیں'' اس معاملے میں ہماری لڑکیاں زیادہ جرأت کا مظاہرہ کرتی ہیں یعنی اگر ان کے ماں باپ راضی نہیں ہوتے ہیں تو پھر وہ اپنے من مندر کے دیوتاؤں کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔ مگر یہ بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی ہے کہ اگرچہ ہمیں اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک ہندوستانی مرد باپ کے زیر اثر ہوتا ہے اور اپنے باپ کے مرنے تک اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتا ہے (کوئیسٹلر ہندوستانی معاشرے کو 'باپو کریسی' کے طور پر بیان کرتا ہے) لیکن جب بیوی کا انتخاب کرنا ہوتا ہے تو اس وقت باپ سے زیادہ ماں اپنی خواہشات کو بیٹے پر مسلط کرتی ہے۔

مردانہ تسلط کے حامل معاشرے میں مادرانہ تسلط کس طرح سے قائم ہوا اس

بارے میں مشہور ماہر نفسیات سدھیر کاکڑ نے اپنی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب "The Inner World" (جہانِ وطن) میں ہندوستان میں بچپن اور معاشرے کے نفسیاتی تجزیے کے مطالعہ کی روشنی میں مفصل طور پر لکھا ہے۔ کاکڑ کا کہنا ہے کہ اگرچہ ہندوستانی لڑکی کو کسی نہ کسی کی بیٹی' بیوی یا ماں سمجھا جاتا ہے لیکن اس کا ادنیٰ مقام اس کے بیٹے اور اس کے درمیان مضبوط تعلقات استوار کرتا ہے جنہیں توڑنا بیٹے کو مشکل لگتا ہے۔ اپنے والدین کے گھر میں وہ عارضی طور پر مقیم ہوتی ہے جسے بیاہے جانے تک وہاں رہنا پڑتا ہے۔ اپنے میاں کے گھر میں وہ ایک ایسے نئے خریدے ہوئے غلام جیسی ہوتی ہے جو اپنی ساس' نندوں اور جیٹھانیوں کی خواہشات کو پورا کرتی ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ بیوی کم اور سالی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے رتبے میں ایک شاندار تبدیلی اس وقت آتی ہے جب وہ ماں بننے والی ہوتی ہے۔ کاکڑ لکھتا ہے: "ایسا صرف ماں بننے سے ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ میں ایک عورت بن جاتی ہے اور اپنی ذات کے لیے اپنے خاندان' برادری اور زندگی کے چکر میں جگہ بنا سکتی ہے۔ اس کا ماں بننا اس میں مادرانہ احساس ذمہ داری کے منفرد احساس کو بیدار کرتا ہے اور اسے اپنے بچوں میں عملی طور پر لامحدود جذباتی سرمایہ وقف کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔"

ہندوستانی مائیں دوسرے ممالک کی عورتوں کی نسبت اپنے بیٹوں کو خواہ مخواہ زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ کچھ انہیں پانچ سال کی عمر تک اپنا دودھ پلانا جاری رکھتی ہیں اور انہیں اسی طرح چومتی چاٹتی رہتی ہیں جس طرح عورتیں اپنے چاہنے والوں کو چومتی چاٹتی ہیں۔ یہ بات بچوں میں یہ تصور پیدا کرتی ہے کہ "میں محبت کے لائق ہوں اس لیے مجھ سے محبت کی جاتی ہے۔" کاکڑ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ "ہندوستانیوں کے کردار کے ساتھ منسوب بہت سی امتیازی خصوصیات اس مخصوص طرز کے بچپن کی میراث کا حصہ ہیں جس میں کچھ اس طرح کے عوامل شامل ہیں مثلاً وابستگیاں پیدا کرنے کی خاطر دوستانہ سلوک پر اعتماد کرنے کے لیے فوری آمادگی' اس تعلق کے مختصر واقع ہونے پر یا اگر اس ابتدائی دوستانہ اقدامات کا جواب اسی شدتِ جذبات کے ساتھ نہ ملے تو شدید مایوسی کا شکار ہو جانا یا پھر تھوڑی سی واقفیت کی بنا پر اپنی زندگی کے اندرونی پہلوؤں کو بیان کر دینے پر آمادگی

ظاہر کرنا اور دوسروں سے بھی اسی طرز کی بے تکلفی کی توقع کرنا وغیرہ وغیرہ۔''

کاکڑ اس ضمن میں ماں اور بیٹے کے گہرے رشتے کے متعلق بہت سے واقعات کا حوالہ دیتا ہے۔ اپنی ماں کے متعلق نہرو لکھتا ہے: ''مجھے اس سے کسی قسم کا خوف نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ میرے کچھ بھی کرنے کو معاف کر سکتی تھی اور اس کی میرے لیے امتیازی اور والہانہ محبت کی وجہ سے میں اس پر تھوڑا بہت غلبہ پانے کی کوشش کرتا تھا۔'' سوامی یوگ آنند اس معاملے میں زیادہ صاف گو تھا۔ وہ کہتا ہے: ''میرے والد مہربان' سنجیدہ اور کبھی کبھار سخت گیر تھے۔ انہیں شدت سے چاہنے کے باوجود ہم سب بچوں کو کسی حد تک ایک مودبانہ فاصلے کو محوظ خاطر رکھنا پڑتا تھا لیکن ماں سب بچوں کے دلوں کی رانی تھی اور ہم سب کو صرف پیار سے سکھاتی تھی۔''

سوال: ''ہندوستانی مرد اتنے برے عاشق کیوں ثابت ہوتے ہیں؟''

جواب: ''وہ اپنی ضرورت کی ساری محبت اپنی ماؤں سے حاصل کر لیتے ہیں اور اپنے بالغ ہونے تک وہ جذباتی طور پر نامرد ہو جاتے ہیں۔''

بھارت سے دنیا کی آگہی کا مسئلہ

باہر کے ملکوں کی سیر کو جانے والے ہندوستانیوں کا ایک مستقل ماتم یہ بھی ہے کہ ''وہاں کے لوگ ہندوستان کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں۔'' دنیا کو ہندوستان سے روشناس کروانے کی خواہش مذہب کی تبلیغ کے شوق کی سی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ باہر کے ملکوں کو جانے آنے والے لوگ اپنے سفارت خانوں کی معلوماتی خدمات سرانجام دینے کی صلاحیتوں میں سے عیب نکالتے ہیں اور غیر ملکیوں کو اپنے ملک کی ہر چیز سے متعارف کروانے کے لیے اپنے ترتیب دیئے ہوئے وفد باہر بھجوانے کا آغاز کرتے ہیں۔ جن چیزوں کو متعارف کروایا جاتا ہے ان میں ہمارے ویدانت' مندر' ہندی چٹنی' کڑھی' ساڑھی کیسے پہنی جاتی ہے' پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے اور ہمارے پاس کیا کیا ہے وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ غیر ملکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ اس عجوبے کے متعلق لاعلمی کا شکار رہنے کو ترجیح دیتے ہیں جسے ہندوستان کہتے ہیں۔

ہندوستان کے بارے میں غیر ملکی کتنے باخبر تھے مجھے اس کا پہلا تجربہ 1948ء میں کینیڈا میں ہوا تھا۔ ہائی کمشنر صاحب دورے پر تھے اور سب کچھ میرے اختیار میں تھا۔ سانحہ حیدرآباد انجام پذیر تھا حتیٰ کہ کینیڈا کے اخبارات نے رضا کاروں اور ہندوستانی فوج کے درمیان ہونے والے سرحدی واقعات کی کہانیاں شائع کیں تھیں۔ تاہم ہمارے اپنے سرکاری ملازمین کی طرح کینیڈا کے اعلیٰ سرکاری ملازم بھی فقط زیادہ دلچسپ سرخیاں

پڑھتے ہیں ۔ حیدر آباد ان کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ ایک صبح مجھے فون کیا گیا۔ ادھر سے آواز آئی: ''یہ وزارت دفاع ہے۔''

''یہ ہندوستانی ہائی کمیشن ہے' میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''محترم آپ جانتے ہیں کہ ہم اکثر و بیشتر ہندوستانی نوابوں کو اسلحہ فراہم کرتے ہیں۔ ماضی میں ہمارا معمول تھا کہ ہم از راہ مہربانی برطانوی حکومت کو مطلع کر دیا کرتے تھے۔ اب جبکہ آپ کا ملک آزاد ہو چکا ہے اس لیے شاید ہمیں آپ کے نوابوں میں سے کسی ایک کے بھی دیئے گئے آرڈروں کو پورا کرنے کے وقت (اسلحہ کے متعلق) آپ کو مطلع کرنا چاہیے۔''

''یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔'' میں نے کہا: ''وہ کون ہے جو اب اسلحہ خریدنا چاہتا ہے؟''

''ہمیں آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا: ''جہاں تک میرا خیال ہے نواب حضرات خود مختار ایجنٹ ہیں لیکن کیونکہ یہ ایک بڑا آرڈر ہے اس لیے ہم شاید آپ کو اس کے متعلق بتا بھی دیں۔'' فقط ''از راہ مہربانی'' اس نے دہرایا۔

''بالکل' بالکل' میں نے اسے نہایت شیریں آواز میں یقین دلایا: ''نواب حضرات کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا وہ ہمارے ہی ملک کے باشندے ہیں۔''

''اچھا تو پھر ہم فوری طور پر ایک لاکھ رائفلیں بھجوا رہے ہیں۔ مجھے ایک مرتبہ پھر نام کی یقین دہانی کر لینے دیجئے۔ جی' نظام آف حیدر آباد کو۔ ان کے نمائندوں نے نقد ادائیگی کی ہے لہٰذا رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''جی بالکل' آپ بھجوا دیجئے۔''

میں ریسیور رکھ کے دوبارہ اٹھا لیتا ہوں اور نئی دہلی کے لیے کال بک کروانے لگتا ہوں۔

ناقابل یقین مستعدی سے پولیس ایکشن کیا گیا جو غیر ملکیوں کی طبیعت پر نہایت گراں گزرا تھا۔ امریکہ اور کینیڈا کے اخبارات دوہرے چہروں والے امن پسند ہندوستانیوں کے اختیار کردہ جارحانہ ہٹلری عزائم کے متعلق شرمناک الزامات سے بھرے ہوئے تھے۔

''انہوں نے نظام آف حیدر آباد کی سرگرمیوں کا غلط مطلب اخذ کیا ہے۔''

میرے ہائی کمشنر نے انتہائی غصیلے لہجے میں کہا اور فرمان جاری کیا: ''پریس کانفرنس بلاؤ' ہم انہیں اس مسئلے کی مکمل تفصیلات سے آگاہ کریں گے۔''

ہم نے پریس کانفرنس بلائی اور اپنے روایتی طریقہ کار کو بروئے کار لاتے ہوئے پہلے اپنے مہمانوں کی مختلف انواع واقسام کی شرابوں سے بھرپور تواضع کی۔ سننے کے موڈ میں لانے کے لیے جب انہیں اچھی طرح تر بتر کیا جا چکا تو اس وقت ہائی کمشنر صاحب نے انہیں خطاب فرمایا۔ انہوں نے صحافیوں کو بتایا کہ کس طرح حیدر آباد ہندوستان کے عین مرکز میں ایک الگ جزیرے کی صورت اختیار کیے ہوئے تھا اور یہ کہ ہندوستان کی آزادی کس طرح سراسر مذاق کا نشانہ بنی رہ سکتی تھی جب تک حیدر آباد اس میں شامل نہ تھا۔ اس کے بعد کمشنر صاحب نے انہیں رضا کاروں کی سفاکیوں سے آگاہ کیا اور امن پسند ہندوستانی فوجوں کی ہونے والی خونریزی کے متعلق بھی بتایا۔

''اب اگر کوئی سوال پوچھنا چاہے تو پوچھ سکتا ہے؟''

ایک خوبرو صحافی خاتون نے ہاتھ بلند کیا: ''جناب ہائی کمشنر صاحب! یہ حیدر آباد واقع کہاں ہے؟''

ہر دم تیار پریس اتاشی یعنی کہ میں' خود کو پہلے ہی سے ہندوستان کے نقشے سے مسلح کیے ہوئے تھا۔ میں نے نقشے کو ایک بورڈ پر پھیلایا اور فاتحانہ انداز سے اپنی انگشت شہادت حال ہی میں مٹائی جانے والی حیدر آباد کی سرحدوں پر دوڑانے لگا۔

''لیکن ہائی کمشنر صاحب تو ہمیں بتا رہے تھے کہ یہ ایک جزیرہ ہے!'' حیرانی میں مبتلا خاتون صحافی نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

ہم نے پریس کانفرنس کے خاتمے کا اعلان کیا اور واپس پینے پلانے کی طرف لوٹ گئے۔

زبان شناسی کے دعووں کا خمیازہ

ہمارے وزیر اعظم صاحب ایسے لوگوں کا مذاق اڑانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں جن بے چاروں کا انگریزی تلفظ معیار کی بلندی کو چھو نہیں پاتا ہے لیکن جب پیرس میں خطاب کرتے ہوئے خود پر بات آئی تو البرٹ کامو (Albert Camus) کے تلفظ پر چوک گئے یعنی درست تلفظ ''کامو'' کی بجائے اسے حروف تہجی کے مطابق ''کاموس'' ہی ادا کرتے رہے۔

غیر ملکی زبانوں کے ساتھ شناسائی کے دکھاوے کی کوشش کرنا آپ کو مصیبت میں مبتلا کر سکتا ہے۔ ایک برطانوی وزیر کے دورۂ ماسکو کا ایک بڑا مشہور قصہ ہے جس نے اپنے میزبانوں کو خوش کرنے کے لیے روسی زبان میں ایک مختصر سی تقریر رٹی ہوئی تھی۔ ضیافت پر جاتے ہوئے راستے میں اسے خیال آیا کہ یہ تو اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ روسی زبان میں ''خواتین وحضرات'' کو کیا کہتے ہیں۔ اس نے گاڑی ایک عوامی بیت الخلا کے باہر روکی اور مطلوبہ الفاظ کا روسی متبادل معلوم کیا۔ لیکن اس کی تقریر کو وہ داد وتحسین وصول نہیں ہوئی جس کی اسے توقع تھی۔ ضیافت کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں میں ایک سے پوچھا کہ آخر بات کیا ہوئی تھی۔ ساتھی نے جواب دیا: ''آپ کی تقریر نہایت شاندار تھی لیکن آخر آپ کو ''مردانہ وزنانہ پیشاب خانے'' سے تقریر کا آغاز کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

❖ ○ ❖

کرم خور چوہے

وہ کیڑے مکوڑے جو ساری گرمیاں ہمارا ناک میں دم کیے رکھتے ہیں مارچ کے پہلے ہفتے میں ناگوار طور پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ جونہی دن میں درجہ حرارت 25 ڈگری سینٹی گریڈ سے تجاوز کرنے لگتا ہے' مچھر' مکھیاں' پتنگے اور کاکروچ وغیرہ نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان حشرات سے نپٹنے کے لیے میں نے خود کو مہلک ہتھیاروں سے مسلح کر رکھا ہے لیکن گھوس یا کرم خور چوہوں کے حملوں کو روکنے کے لیے میں ابھی تک مؤثر ذرائع کی تلاش میں ہوں۔ میں نے ایک درجن سے زائد بلیاں پال رکھی ہیں۔ ان بلیوں نے چوہوں' چھپکلیوں اور (بدقسمتی سے) گلہریوں کی تعداد میں نہایت خوش اسلوبی سے نمایاں کمی کر دی ہے لیکن وہ بینڈی کوٹس کا پیچھا نہیں کرتی ہیں کیونکہ یہ شدید بدبودار ہوتے ہیں اور شاید کھانے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ مجھے ان مُورخور بڑے بڑے چوہوں سے خوف آتا ہے حالانکہ میں نے اپنے دروازوں کی تہوں میں موٹے نمدے کے ٹکڑے ٹھونس رکھے ہیں لیکن وہ اس کے نیچے سے اندر گھس آنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ایک دن صبح سویرے میں جونہی اپنے مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوا' ایک بینڈی کوٹ نے یکے بعد دیگرے چک' چک' چک کی مترنم آوازوں کے ساتھ اپنی موجودگی کا اعلان کیا اور نہایت بے باکی سے میری جانب لپکا۔ میں نے فوراً ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب اس پر دے ماری اور جست لگا کر صوفے پر چڑھ گیا۔ خود کو جہل قدمی

کے لیے استعمال کی جانے والی چھڑی سے مسلح کرنے کے بعد میں نے صوفوں' میزوں' بستروں کے گرد اور غسل خانے میں اس کا پیچھا کیا۔ جب اس کو نکلنے کا راستہ نہیں ملا تو اس نے بہادری سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں دم دبا کر اپنے مطالعے کے کمرے کی طرف بھاگا اور وہاں پہنچ کر اپنے پیچھے دروازے کو بند کر دیا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا اور اخبار کے مطالعے میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اپنی ردی کی ٹوکری میں سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ اس کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں تیزی سے اپنے بیڈ روم میں پہنچا اور اپنی بیوی کو گھر میں موجود دشمن سے ہوشیار کیا پھر ہم دونوں نے گھر کے تمام دروازے کھول دیئے اور خود کو جھاڑو اور تولیوں سے لیس کر لیا بالآخر ہم حملہ آور گھوس کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اس موقع پر ہماری بلیاں یوں ظاہر کر رہی تھیں جیسے انہوں نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔

کیا کوئی جانتا ہے کہ خدا نے کرم خور چوہے کیوں پیدا کیے؟ یہ اپنی نوع کے دوسرے بڑے چھوٹے چوہوں کی طرح سب کچھ کھا جاتے ہیں لیکن ان کو کوئی نہیں کھائے گا۔ یہ بے دردی سے اپنی تعداد میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ گند اور بیماریاں بھی پھیلاتے ہیں۔ اس گندی مخلوق کے متعلق جتنا بھی مواد میں پڑھ سکتا تھا میں نے وہ سب پڑھ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کام کی کوئی بات جو مجھے مل سکی وہ لفظ ''بینڈی کوٹ'' کی تخلیق کے بارے میں تھی' دراصل یہ تیلگو لفظ ''پانڈی کوکو'' یعنی ''سؤر چوہا'' کی انگریزی زبان میں کی جانے والی کرپشن ہے۔

یپی: ہندوستان کا مستقبل؟

چند ماہ پہلے تک میں یپیوں (Yuppies) کی موجودگی سے بالکل بے خبر تھا۔ یہ لوگ تقریباً پچھلے 30 سالوں سے پائے جاتے ہیں اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اب یہ تقریباً ناپید ہو چکے ہیں لیکن آج کل مجھے بہت سے جرائد میں ان کے متعلق چھپا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میں اپنی کسی بھی لغت میں اس کا سراغ نہیں لگا سکا ہوں۔

دراصل ''Yuppy'' YUP کو کھینچ کر لمبا کیا گیا ہے جو کہ ''Young Urban Professional'' کا مخفف ہے۔ استعمال کی جانے والی ایک اور اصطلاح ''Yumpy'' تھی جو (Upwardly Mobile Professional) کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ ''Yuppy'' افراد Yippies اور سے کوئی مماثلت نہیں رکھتے ہیں۔ یہ افراد جن کی موجودگی کا مجھے ان کے زوال کے بعد علم ہوا درحقیقت ان نوجوان (50 سال سے کم عمر) افراد پر مشتمل ہیں جو مشہور یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور یہ لوگ اپنے بل بوتے پر خوب دولت بھی کما رہے تھے۔ ایک یپی بننے کے لیے کم از کم 35 ہزار ڈالر سالانہ کی آمدن ضروری تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ ننھے منے نو دولتیوں (Baby Boomers) کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے تھے کیونکہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ یپی افراد میں Dinks یعنی ''Double Income no Kid'' ممتاز

حیثیت رکھتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آپس میں میاں بیوی ہونے کے باوجود بچے پیدا نہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور معقول آمدن کے بھی مالک تھے۔ ایک وقت تھا کہ یہ لوگ امریکی معاشرے میں نمایاں سیاسی اور ثقافتی قوت بن گئے تھے۔

اگرچہ ہپی افراد نے ایسا کوئی گروہ تشکیل نہیں دیا جو ان کی پہچان کا باعث بنتا لیکن پھر بھی امیر نوجوانوں کی اس فطری ہمدردی نے ایک قابل پہچان طرز زندگی کی حیثیت سے نشوونما پائی تھی۔ مثلاً ایک عدد بی ایم ڈبلیو (BMW) سپورٹس کار' گھر کے باہر چھپر میں برنارڈ یا افغان ہاؤنڈ کی اعلیٰ نسل کا بندھا ہوا کتا اور بہترین ملبوسات یعنی بروکس برادرز کی شرٹیں اور وین ہیوزن سے خریدی گئی ٹائیاں ان کی پہچان تھیں۔ ان لوگوں نے آرٹ' موسیقی اور ادب میں ادراک کے لیے بناوٹ کو ترقی دی' سیاستدانوں اور نودولتیوں کو نظرانداز کیا' سلاد پر مشتمل کم خرچ کھانے کھائے اور چرچ کا منہ شاذونادر ہی دیکھ رکھا تھا۔

جیسا کہ عموماً ہوتا ہے امریکہ میں فیشن کا درجہ رکھنے والی چیز چند سالوں بعد ہندوستان میں زور پکڑ لیتی ہے لیکن ہندوستانی ہپی اپنی مثال آپ تھے۔ بھارتی نوجوان دولت مندوں میں سے میری شناسائی صرف ان نوجوانوں تک محدود ہے جو شمالی ہندوستان میں پلے بڑھے ہیں اور جو زیادہ تر پنجابی یا مارواڑی شجرۂ نسب رکھتے ہیں۔ میں کچھ ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہوں جن سے آپ کو شاید ان افراد کو پہچاننے میں مدد مل سکے گی۔ ہندوستانی ہپی امریکی ہپی کی طرح دولت مند باپ کا بیٹا ہے اور نودولتیا ہرگز نہیں ہے لیکن ماضی کے اپنے ہمزاد کے برعکس یہ ہندوستانی ہپی کسی مشہور پبلک سکول یا جواہر لعل نہرو یونیورسٹی یا کسی بین الاقوامی اعلیٰ تعلیمی ادارے کی پیداوار نہیں ہے لہٰذا ان کی صلاحیتیں' سول سرونٹ' یا پھر ''باکس والا'' کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ ہمارے ہپی کے پاس دوسرے درجے کے کالج سے حاصل کی گئی کامرس کی ڈگری ہوتی ہے۔ یہ صاحب امریکی کاروباری اصطلاحات سے مکمل طور پر شناسا ہوتے ہیں اور ان اصطلاحات کا تلفظ ناک سکیڑ کر ادا کرتے ہیں جن میں سے انگریزی کے بیشتر الفاظ کو غلط ادا کر دیتے ہیں' عموماً اپنے والدین کے ساتھ ہی ساتھ رہتے ہیں لیکن اپنا کچن الگ چلاتے ہیں۔ ان کے

پاس ایئر کنڈیشنڈ مرسیڈیز، ٹویوٹا یا ڈاٹسن ہوتی ہے۔ یہ صاحب خوش بختی کے پتھروں سے آراستہ سونے یا پلاٹینم کی انگوٹھیاں اور کبھی کبھار گلے میں تعویذ بھی پہنتے ہیں۔ ان کے پاس مہنگے ترین برانڈ کی سوئس گھڑیاں پائی جاتی ہیں جیسے کارٹیئر، اومیگا، رولکس یا ایسی دیسی ساخت کی پاٹک فلپ جن پر ان کا نام کھدا ہوا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ائرپورٹ پر یہ صاحب ہندی کومکس یا فلمی رسالے جیسا کہ سٹار ڈسٹ، فلم فیئر یا سین بلٹز (Cine Blitz) وغیرہ خریدتے ہیں اور ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ فائیو سٹار ہوٹلوں میں اعلیٰ برانڈ کی اسکاچ پیتے ہیں۔ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ کسی آشرم میں موصوف اپنے گرو سے ملاقات کرتے ہیں اور جب اپنے شہر سے باہر ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی کال گرل کا انتظام بھی رکھتے ہیں۔ یہ وہ صاحب ہیں جو ہمارے ہندوستان کے مستقبل کی امید ہیں۔

تاملوں سے رابطہ سازی

میں اعتراف کرتا ہوں کہ اپنے ملک کی جنوبی ریاستوں میں ہونے والی سیاست میری سمجھ سے بالاتر ہے اور اس کی بڑی وجہ یقیناً مجھ میں ان الفاظ کو درست انداز میں ادا کرنے کی عدم صلاحیت ہے جو دراوڑی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ بول چال کے لحاظ سے میں نے پونا سے لے کر ''وجیاوڑا'' تک ایک سرحد کھینچ رکھی ہے۔ ملک کے شمالی تین چوتھائی حصوں میں ہونے والی سیاسی سرگرمیوں کو سمجھنے میں مجھے زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ مجھے کسی قسم کی امارت پرستی کا سامنا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود جونہی پونا سے ''وجیاوڑا'' تک کھینچی ہوئی سرحد پار ہوتی ہے تو میں مکمل طور پر دوسروں کی رائے کے رحم و کرم پر ہوتا ہوں۔ اس کے برعکس جنوبی ہندوستان سے تعلق رکھنے والے اپنے دوستوں کے ساتھ بات چیت کے دوران واضح احساس کمتری لاحق ہوتا ہے کیونکہ وہ ہم سے زیادہ دانشمند ہیں' ان کے ذہن تیز تر ہیں اور ہماری نسبت وہ اپنی تہذیب اور روایات کے ساتھ گہری وابستگی کی وجہ سے زیادہ بھارت واسی دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے انہیں شمالی علاقوں کے لوگوں کی نسبت زیادہ پرکشش اور حسین بھی پایا ہے۔ ہمارے ملک کا ایسا کون سا علاقہ ہے جو سری دیوی یا جیا پرادا جیسے حسن کا متبادل پیش کرسکتا ہے؟ یا پارلیمنٹ میں کسی ایسی خاتون کو اپنا نمائندہ بنا سکتا ہے جو جے للیتا رام جتنی خوبصورت اور خوش گفتار ہو؟ میرا تعلق پنجابیوں کے اس نیم پڑھے لکھے طبقے سے ہے جو جنوبی پونا کی جگہوں اور شخصیات کا بالکل ویسا ہی احترام کرتے ہیں جیسے مدراس اور اس کے باسیوں کا کیا جاتا ہے۔ جنوب کے رہنے والوں کے خلاف ذہنی الجھن کی تمام تر وجہ وہ مشکل

مشکل نام ہیں جو انہوں نے اپنے لیے اور اپنے علاقوں کے لیے استعمال کر رکھے ہیں۔ مثلاً ہم بودی نایکا نور' تیرو چیراپالی' اپٹیلی پاپن' اراجی زہی ین' ازاگی یا سہار وغیرہ جیسے ناموں کے ساتھ کس طرح نبرد آزما ہو سکتے ہیں؟ دراویدا مینترا کازہاگم (Dravida Munetra Kazhagam) کے ہم عادی ہو چکے ہیں لیکن اب ایک اور پارٹی بھی منظر عام پر آ چکی ہے جسے تمیز ہاگر مینترہ منانی (Tamizhagar Munnetra Munnani) کہا جاتا ہے۔

ہمارے تامل بھائی بہن اپنی پیچ دار سیاست کے ذریعے ہماری گھبراہٹ میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ ہمیں تو یہی بتایا گیا تھا کہ دراویدہ تحریک کو پریار نے شروع کیا تھا اور انادرائی اور ایم جی راما چندرن نے مل کر آگے بڑھایا تھا جو دراصل خدا مخالف' آریا مخالف' ہندی مخالف اور سب سے بڑھ کر برہمن مخالف تحریک تھی لیکن اب ہم ایم جی راما چندرن صاحب کے جھنڈے کو ان دو خواتین کے ہاتھوں میں لہراتا ہوا دیکھتے ہیں جو برہمن ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسری جماعتوں کے ساتھ ان کے بار بار بدلتے ہوئے الحاق نے سیاسی منظر کو مزید ابتر بنا دیا ہے۔ مقابلہ کرنے والی چاروں بڑی جماعتیں یعنی ڈی ایم کے (دراویدہ منیترا کازہاگم) انڈین کانگریس اور دونوں آل انڈیا الائنس آف ڈی ایم کے وغیرہ سب کی سب کسی بھی قسم کے کمیونسٹوں اور کسی بھی دھڑے کی مسلم لیگ کے ساتھ الحاق کرنے کے لیے بے تاب دکھائی دے رہی ہیں اور ان سب کے منشور تقریباً ایک جیسے ہی ہیں۔ خواتین کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے سب نے وعدے کیے ہیں کہ اعلیٰ عہدوں پر خواتین کی نشستیں مخصوص کی جائیں گی۔ حالانکہ ان جماعتوں کے امیدواروں کی فہرستیں بہت کم خواتین امیدواروں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے تامل ناڈو میں امیدوار کی جس خوبی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے' وہ اس کے سیاسی میدان میں سرانجام دیئے گئے کارناموں کی بجائے سینما سکرین پر دکھائی جانے والی پرفارمنس ہے۔ کانگریس نے بھی اس بات کو بھانپ لیا ہے۔ اس لیے کانگریس راجیو گاندھی کو ایک فلمسٹار کی طرح نمایاں کرنے پر بھرپور انحصار کر رہی ہے' پارٹی کی امیدیں راجیو کی ماضی میں وزیر اعظم کی حیثیت سے دکھائی جانے والی کارکردگی کی بجائے اس کی دلکش نگاہوں سے وابستہ ہیں۔ اس کی جاذبیت خواتین ووٹروں کے ہاں شاید ترپ کا پتہ ثابت ہو۔ آپ کے لیے تامل کی جمہوریت کا یہی منظر کافی ہے!

مہلک پیشہ

گوشت کھانے والے کسی بھی شخص کو سبزی خور انسان بنانے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ اسے جانوروں کے ذبح خانے کی سیر کروائی جائے۔ ایک مرتبہ کلکتہ میں کالی کے مندر کے باہر بکریوں کے سروں کو تن سے جدا ہوتا دیکھنے پر میرا معدہ ہل کر رہ گیا تھا اور میں کئی راتوں کو سو نہیں سکا تھا۔ پھر میں نے خود کو اس بات پر قائل کیا کہ دنیا کے بہت سے علاقوں میں انسان جانوروں' پرندوں اور مچھلیوں کو شکار کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے حالات کے پیش نظر کم از کم جو بہتری ہم لا سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اُن جانداروں کو پہنچائی جانے والی اذیت کو کم سے کم کر دیں جن پر ہم اپنی بقا کے لیے انحصار کرتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس امر کو یقینی بنانے کے لیے جو تدبیر اختیار کی گئی ہے وہ جانوروں کو ذبح کرنے سے پہلے سُن کرنا ہے اور یہ کہ کسی بھی جانور کو اس جیسے دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہیں کیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں دوسرے قوانین بھی ہیں جو اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ ذبح خانے انسانی آبادی سے دور واقع ہیں' صاف رکھے گئے ہیں اور کوئی بیمار جانور خوراک کی لیے ذبح نہیں کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ویسے ہی قوانین بنائے گئے ہیں لیکن محض کاغذوں کی حد تک۔ عملی طور پر کسی ایک کی بھی پاسداری نہیں کی ہوتی ہے۔ شہر میں لاتعداد غیر قانونی ذبح خانے موجود ہیں۔ دلی میں موجود سب سے بڑا ذبح خانہ 80 سال سے زائد عرصہ قبل تعمیر کیا گیا تھا جو آج ایک پُر ہجوم علاقے کے درمیان

واقع ہے جہاں نزدیک ہی ایک مندر اور اسکول بھی موجود ہے۔ اس ذبح خانے کی چھ ایکڑ اراضی میں سے دو ایکڑ قبضہ گروپ کے پاس میں ہے جبکہ باقی ماندہ چار ایکڑوں میں روزانہ تقریباً 3000 بھینسوں اور 10,000 بھیڑ بکریوں کی گردنیں چیری جاتی ہیں اور ان کے خون کو ایک دوسرے کے سامنے بہایا جاتا ہے۔ بہت سے جانوروں کو دور دراز کے علاقوں سے ٹرکوں میں ایک دوسرے پر لاد کر یا پھر دور دراز سے ہانک کر لایا جاتا ہے۔ اپنی منزل پر پہنچنے تک یہ جانور فاقہ زدہ' پیاسے یا بیمار ہو جاتے ہیں۔ ان کے مالک کوئی پروانہیں کرتے کیونکہ انہیں بہر حال مر ہی جانا ہوتا ہے۔ کئی سالوں سے انتظامیہ وعدے کرتی آ رہی ہے کہ اس ذبح خانے کو شہر سے دور ایک بستی میں لے جایا جائے گا اور جدید بنایا جائیگا۔ اس مقصد کے لیے ایک خطیر رقم (میرے خیال میں 20 کروڑ روپے سے زیادہ) مختص کر دی گئی ہے۔ ابھی تک کوئی متبادل جگہ مل نہیں سکی ہے۔ حالانکہ چار افسران بالا ذبح کرنے کے جدید طریقوں کی تعلیم حاصل کرنے کا چکر چلا کر باہر کے ملک کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔ ہے نا سکینڈل بننے والی بات!

اس کوتاہی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والا واحد گروپ نوجوان لڑکیوں پر مشتمل ہے' جنہوں نے پُل کے نیچے دفتر قائم رکھا ہے۔ یہ دفتر ''Friendicoes-seca'' (انسداد بے رحمیٔ حیوانات) کے تحت سرگرم عمل ہے۔ اس ادارے کی ابتدائی طور پر کفالت مانیکا گاندھی کر رہی تھیں۔ اعلیٰ حکام کو نیند سے جگا کر اقدامات کرنے کے لیے اُن کی جانب سے کی جانے والی کوششیں ابھی تک بارآور ثابت نہیں ہو سکی ہیں۔ وزیراعظم کے ساتھ ملاقات کا وقت طے کرنے کے لیے اس گروپ کی جانب سے کی جانے والی درخواستوں کا ابھی تک جواب موصول نہیں ہوا۔ آج کل جبکہ مذہبی تنازعات عام ہیں' ذبح خانے کی صورتحال ان تنازعوں کے امکانات میں انتہائی اضافے کا باعث بن سکتی ہے یعنی ہر کوئی' کسی کو بھی اپنے فرائض سے کوتاہی کا الزام دینے لگے گا۔

❖ ○ ❖

سنسر کا ''درندہ''

اپنے طویل صحافتی اور ادبی کیریئر کے دوران میری کسی بھی تحریر کو سنسر کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔ حالانکہ مجھے عدالتوں میں گھسیٹا گیا ہے اور پریس کونسل کے سامنے پیش کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود سنسر کبھی نہیں کیا گیا ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمارے ملک میں جو رائے کی آزادی کے لیے برسرپیکار ہے ''سنسر'' نامی ایک درندہ بھی پایا جاتا ہے ماسوائے اس بات کے کہ تمام فلموں کو عام نمائش سے پہلے سنسر بورڈ سے کلیئرنس لینا ہوتی ہے۔ پرنٹ میڈیا اور فلموں میں ایک موضوع ایسا ہے جس کے لیے متضاد قوانین لاگو ہوتے ہیں۔ وہ موضوع یہ ہے کہ آپ کسی شخص کی شان میں لکھ کر گستاخی کر سکتے ہیں لیکن ویسی ہی گستاخی آپ فلم میں نہیں دکھا سکتے ہیں۔ یہ منطق سمجھ سے باہر ہے لیکن لکیر کے فقیر سنسر والوں کا کہنا ہے' قانون' قانون ہے۔

ایسی کونسی بات ہے جو چندراسوامی کے متعلق نہیں لکھی گئی ہے؟ اور یہ سب اگر سچ نہیں ہے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ ان اخبارات کے خلاف جس میں یہ سب شائع کیا گیا ہے بھاری نقصان کیے جانے کی مد میں ہرجانے کا دعویٰ کردے۔ چندراسوامی کو جعلسازی' بلیک میلنگ' غیرملکی زرمبادلہ کے قوانین کی خلاف ورزی اور پامیلا بورڈس کی دلالی کا مرتکب قرار دیا گیا ہے' لیکن جب میں نے یہی بات ہندوستانی ٹی وی کے پروگرام ''انڈیا دیو'' کو دیے جانے والے انٹرویو کے دوران کہی تو سنسر والوں نے اس انٹرویو میں

سے یہ الفاظ حذف کر دیئے: ''وہ بہت سی دوسری غیر قانونی سودے بازیوں یعنی بوفورس اور سینٹ کیٹس سکینڈل وغیرہ میں بھی ملوث ہے' اس کے علاوہ وہ لوگوں کی خفیہ ٹیپ ریکارڈوں کی مدد سے گفتگو ریکارڈ کرتا ہے اور جعلسازی میں بھی شامل ہے۔'' ان الفاظ پر مجھے اس طرح منہ ہلاتے ہوئے دکھایا گیا ہے جیسے پانی کے برتن میں رکھی جانے والی مچھلی بغیر کسی آواز کے سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔ آخر میں اچانک میری آواز کو ان الفاظ کے ساتھ بحال کر دیا جاتا ہے۔ ''قصہ مختصر' وہ ایک انتہائی مکروہ کردار کا حامل شخص ہے۔'' اس جملے پر سنسر کو کوئی اعتراض نہیں تھا' اس حکمت عملی کی آخر کیا منطق ہے؟

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں

کسی بھی بڑے شہر سے باہر جانے کے لیے صبح سویرے ٹرین کے ذریعے کیا جانے والا سفر ایک تے آور تجربہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ریل کی پٹڑی کے دونوں اطراف لوگوں کی قطاریں اپنی پشت کو گزرتی ہوئی ٹرین کی جانب کیے ہوئے رفع حاجت میں مصروف دکھائی دیتی ہیں۔ ان لوگوں کی بڑی سادہ سی منطق ہے۔ اگر وہ گزرتی ہوئی ٹرین کو نہیں دیکھ سکتے تو پھر اگر ان ٹرینوں میں سوار مسافر یہ دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کس عمل میں مصروف ہیں تو انہیں اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ہم ایسے بیت الخلا کیوں نہیں بنا سکتے ہیں جہاں لوگ معقول طریقے سے رفع حاجت کر سکیں؟ میرے مشاہدے میں ایک اور بات یہ آئی ہے کہ ان رفع حاجت کرنے والوں میں کوئی عورت موجود نہیں تھی۔ یہ بیچاری اپنے پچھلے حصوں کو سرعام نمایاں کرنے کے معاملے میں بہت شرمیلی ہیں' اس لیے اس وقت تک تکلیف برداشت کرتی ہیں جبکہ باہر مناسب اندھیرا نہیں ہو جاتا ہے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ ویشالی (بہار) سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان بیندیشور پاٹھک کو اس سلسلے میں کچھ کرنے کے لیے کس قسم کے تجربے نے اکسایا ہوگا۔ اس کا تعلق ایک معمولی آمدنی والے گھرانے سے تھا اور جب وہ اپنی ماسٹر اور اس کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے مصروف عمل تھا تو اس دوران اسے اپنے ایک چچا کے ساتھ رہنا پڑا تھا جو ایک کالج میں چائے کی دکان چلاتے تھے۔ یا پھر شائد یہ ان

بھنگیوں کو جو اپنے سروں پر بدبودار فضلہ اٹھا کر لے جاتے ہیں' دیکھنے کے بعد ہوا تھا جسے دیکھ کر ان آٹھ لاکھ سے زائد بدقسمت کارکنوں پر مسلط کی جانے والی توہین سے اس کا خون کھول اٹھا ہوگا۔ ہر گھر میں لیٹرین کیوں نہیں ہے؟ اور ہر سڑک پر مرد و خواتین کے لیے لیٹرینوں کی قطاریں کیوں نہیں بنائی جا سکتی ہیں؟ کیا ایسی لیٹرینیں نہیں بنائی جا سکتی ہیں جن میں صفائی کا خود کار نظام موجود ہو اور انسانی فضلے کو کام میں لایا جا سکے؟ بندیشور پاٹھک نے ایسی ہی ایک لیٹرین کا ڈیزائن تیار کیا۔ دو لٹر پانی کی مقدار انسانی فضلے کو چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں بھیج دیتی تھی جہاں بکٹیریا اس کی صفائی کر دیتے تھے اور اس عمل سے بننے والی گیس' آگ اور بجلی پیدا کرنے کے لیے پائپ کے ذریعے منتقل کر دی جاتی تھی اور یہ سب کچھ غریب سے غریب گھرانے کی پہنچ میں تھا۔ پہلے پہل کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ لیکن پھر اسے ستر ا پرساد کی شکل میں ایک پُر جوش معاون مل گئی جو کہ بہار کی حکومت میں وزیر تھی۔ اس نے پاٹھک کو گرین سگنل دیا اور یوں 1970ء میں پٹنہ کے مقام پر ''سولابھ سچلیا سنستھان'' کا آغاز ہوا۔ آج یہ سلسلہ ان لاکھوں سچلیاؤں کی مدد سے پورے ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے جو لوگوں کی آمدنی میں اضافہ کر رہی ہیں' گھروں اور بستیوں کو روشن کر رہی ہیں اور انہیں کھانا پکانے کے لیے سستی گیس فراہم کر رہی ہیں۔ 1991ء میں پدم بھوشن ملنے پر پاٹھک کو ملک گیر شناخت حاصل ہوئی جبکہ پوپ جان پال سے شرف ملاقات حاصل ہونے اور 1992ء میں ماحول کی بہتری کے لیے شاندار خدمات کے اعتراف میں دیا جانے والا سینٹ فرانسس پرائز ملنے پر اسے بین الاقوامی شناخت نصیب ہوئی۔

اس وقت سے پاٹھک نے بھنگی خاندانوں کے محروم بچوں کو تربیت اور روزگار مہیا کرنے کے لیے اپنی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ پالم ایئرپورٹ کے نزدیک مہاویر نگر میں واقع اس کا ادارہ لڑکے اور لڑکیوں کو کار ڈرائیو' الیکٹریشن' ترکھان' ٹائپسٹ' درزی اور مکینک وغیرہ بننے کی تربیت دیتا ہے۔ اسی جگہ ''سچلیاؤں'' کے بہت سے ماڈل نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔ اگر اس بات کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا ہو کہ انسانی فضلے سے کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں اور اس ضمن میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اور کیا کچھ کیا جا چکا ہے تو یہ جگہ واقعی قابل دید ہے۔ ڈاکٹر بندیشور پاٹھک صحیح معنوں میں پوری قوم کی داد کے مستحق ہیں۔

ایک قومی تہوار کی ضرورت ہے!

کیا آپ کو کبھی اس بات کا احساس ہوا ہے کہ ہمارے یعنی ہندوستانیوں کے ہاں کوئی ایسا مشترکہ تہوار نہیں ہے جسے ہم سب اپنے اپنے گھروں میں ایک ہی انداز سے منا سکتے ہیں؟ اور یہ کہ اگر ایسا کوئی تہوار ہوتا تو شاید یہ ایک خوش آئند بات ہوتی؟ میرے ذہن میں یہ خیال اس وقت تک نہیں ابھرا تھا جب تک کہ بنگلور سے تعلق رکھنے والی ایک کاروباری شخصیت وکاش گوئنک نے میری توجہ اس طرح مبذول نہیں کروائی تھی۔ ان صاحب کا کہنا تھا: ''ہمارے ہاں بے شمار تہوار منائے جاتے ہیں لیکن سب مذہبی یا علاقائی نوعیت کے ہیں جبکہ ہمارے ہاں ایک بھی قومی تہوار ایسا نہیں ہے جسے ذات پات' عقیدے' مذہب یا علاقے کی مناسبت سے قطع نظر ہر ہندوستانی ایک ہی دن اور ایک ہی انداز سے مناتا ہو۔''

ان صاحب کے کہنے پر میں نے جتنا زیادہ غور کیا اتنا ہی زیادہ مجھے ان کی بات کے سچ ہونے کا احساس ہوا۔ مسلمانوں کی تین عیدیں ہیں جبکہ غیر مسلموں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے ماسوائے اس بات کے کہ وہ رمضان کے دوران کبھی کبھار مسلمانوں کے ساتھ افطار میں شریک ہو جاتے ہیں۔ عیسائی کرسمس مناتے ہیں اور وہ لوگ جو عیسائی نہیں ہیں ان کے لیے یہ تہوار ایک نظارے یا پھر ٹی وی یا ریڈیو پر کرسمس کے گیت سننے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ سکھ اپنے گروؤں کے جنم دن مناتے ہیں اور دوسرے (ہندو' مسلم' عیسائی) انہیں گرنتھ صاحب کا جلوس کو بینڈ باجوں اور شلوک پڑھنے والوں کے عظیم الشان گروہ کی معیت میں نکالتے ہوئے محض دیکھتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں بہت سے تہوار پائے جاتے

ہیں لیکن وہ سب مختلف علاقوں میں مختلف اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور انہیں مختلف انداز میں منایا جاتا ہے۔ سب سے مقبول تہوار دیوالی پوجا کے طور پر منایا جاتا ہے۔ مشرقی علاقوں میں اسی دن کالی یا درگا کی پوجا کی جاتی ہے جبکہ مغربی علاقوں میں اسے لکشمی دیوی کو خراج عقیدت پیش کر کے منایا جاتا ہے جنوب میں اسے بلی پریامی اور نرا کو چتر داسی کہتے ہیں۔ دسہرا کا تہوار جو دیوالی سے پہلے آتا ہے۔ بنگال میں اس تہوار کو درگا پوجا کے طور پر تمام میدانی علاقوں میں رام لیلا اور جنوب میں ایودھا پوجا کے طور پر منایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے موسمی تہوار تک مختلف ہیں۔ پنجاب میں بیساکھی کہلایا جانے والا تہوار آسام میں بیہو کہلاتا ہے۔ ایسے تہوار جنہیں عموماً قومی تہوار کہا جاتا ہے' یہ سب تو آزادی کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ مثلاً یوم آزادی (15 اگست)' پبلک ڈے (26 جنوری)' گاندھی جی کا جنم دن (12 اکتوبر) اور پنڈت نہرو کا جنم دن (14 نومبر) وغیرہ وغیرہ۔ باپو گاندھی اور چاچا نہرو دونوں کے جنم دن ان چھٹیوں سے زیادہ کی اہمیت نہیں رکھتے ہیں جن میں ان کی سمادھیوں پر رسمی بھجن گائے جاتے ہیں۔ یوم آزادی اور پبلک ڈے سرکاری افراد سے منسلک ہیں۔ صدر' وزرائے اعلیٰ اور گورنروں کی جانب سے ترنگا لہرایا جاتا ہے۔ مسلح افواج کی پریڈ اور ہمارے ملک کی عسکری طاقت کی نمائش ہوتی ہے۔ عام ہندوستانی کا کردار اس میں صرف ایک تماشائی کا ہے۔ کیا ہم امریکی (Thanks giving) کی طرح ایک تہوار پر متفق ہو سکتے ہیں جس کا مطلب ہے ہر ہندوستانی کے لیے ایک سرگرمی اور اسے ہر گھر میں ایک سے انداز اور ایک سا کھا پی کر منایا جاتا ہے۔ دکاش صاحب کی تجویز نہایت موزوں ہے کہ اس تہوار کے لیے سب سے موزوں ترین انتخاب 26 جنوری کا ری پبلک ڈے ہو سکتا ہے۔ پہلا کام اس دن کو سرکار کے نرغے میں سے نکالنا ہے۔ ریپبلک ڈے پر آگے بڑھتی اور پسپا ہوتی ہوئی پریڈیں ہم نے بہت دیکھ لی ہیں۔ یہ دوسرے موقعوں پر بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ دیوالی پر منائی جانے والی رنگارنگی کا اس تہوار میں اضافہ کر دیا جائے یعنی گھروں میں چراغاں' آتش بازی اور ایک دوسرے (خاص طور پر بچوں) کو تحفے تحائف دینا وغیرہ وغیرہ۔ دکاش گوئنک کا خیال ہے کہ اس موقع کے لیے موزوں ترین مٹھائی لڈو ہونی چاہیے کیونکہ یہ چھوٹے چھوٹے دانوں کو یکجا کر کے بنائی جاتی ہے۔ آپ کے خیال میں یہ کیسا رہے گا؟

❖ ○ ❖

مانیکا گاندھی اور کے ایف سی

میں نے کرنل سینڈر کے کنٹکی فرائیڈ چکن (KFC) کو آج سے دس سال پہلے اس وقت دریافت کیا تھا جب میں ہوائی یونیورسٹی میں پڑھایا کرتا تھا۔ میں نے اسے ہندوستان میں ملنے والے تندوری چکن جتنا ہی لذیذ اور صحت بخش پایا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ (KFC) کا کھانا کسی بھی ہوٹل میں ملنے والے کھانے سے کہیں سستا تھا۔ جہاں یہ تندوری چکن پر سبقت لے جاتا ہے وہ اس کے ذائقے میں پائی جانے والی مستقل حالت ہے کیونکہ تندوری چکن یا تو بہت اچھا بن جانے کا یا پھر آدھا کچا رہ جانے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے اور پھر مصالحوں میں بھی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ کنٹکی اور اس کے ساتھ ملنے والی گریوی کے ذائقے میں کبھی فرق نہیں آیا اور کھانے والا ہمیشہ انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہے۔ یہ کل بھی بہترین فاسٹ فوڈ تھا اور آج بھی ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ وہ لوگ اسے ''جنک فوڈ'' (بیکار کھانا) کیوں کہتے تھے۔ مقابلے کی فضا کا سامنا کرنے والے عمدہ ریستورانوں کے مالکان سے مجھے اسی بات کی توقع تھی کہ وہ پیزا' برگر' چپس اور فرنچ فرائز کو ایسی خوراک ہی کہیں گے جو تفریح کی بجائے صرف غریبوں کا پیٹ بھرنے کے کام آتی ہے۔ مجھے یہ بھی امید تھی کہ ایک نہ ایک دن ''جنک فوڈ'' کے نام سے یاد کیے جانے والے اس کھانے کو کوئی ہندوستانی ہندوستان میں متعارف کروائے گا۔

چند ماہ پہلے بنگلور میں کنٹکی فرائڈ چکن (KFC) کا افتتاح ہوا تھا' جن شرائط پر

ہندوستانی حکومت کی جانب سے (KFC) کے ملک بھر میں شاخیں کھولنے کا معاہدہ طے پایا تھا وہ سب ہندوستان ہی کے فائدے میں تھیں۔ تمام سرمایہ امریکی ہے۔ پہلے سات سال میں ہونے والے منافع کی ہندوستان میں ہی سرمایہ کاری کی جائے گی جبکہ یہ ہزاروں ہندوستانیوں کو روزگار فراہم کرے گا اور اس سے پولٹری کے کاروبار کو ترقی ملے گی جس بات کا ان لوگوں نے حساب کتاب نہیں لگایا تھا وہ ہمارے معاشرے کے ایسے عناصر تھے جن کا موجب وہ لاپرواسیاستدان تھے جو کسی سے بھی پیسے بٹورنے کے لیے حب الوطنی کے جذبے کے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بس پھر بنگلور میں ایک مزاحمتی تحریک شروع کی گئی۔ پروپیگنڈا کرنے کے لیے ایسے اشتہارات تقسیم کیے گئے کہ جن میں لکھا ہوا تھا کہ اس ریسٹورنٹ میں گاہکوں کو مضرصحت اور کیمیکل وغیرہ کھلا کر موٹی کی گئی مرغیوں کا گوشت کھلایا جاتا تھا۔ لیکن مرغیاں فراہم کرنے والی کمپنی کے پولٹری فارم میں لیبارٹری ٹیسٹ کرنے پر یہ بات غلط ثابت ہوگئی اور سارے الزامات جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوئے۔ کرناٹک ہائی کورٹ نے بنگلور میں ریسٹورنٹ بند کرنے کا فیصلہ التوا میں ڈال دیا۔ دہلی میں (KFC) کی کھولی جانے والی دوسری شاخ کو بھی اسی طرح گھیراؤ کرنے اور مقدمہ چلانے کی دھمکیاں دی گئیں۔ اس تحریک کی مرکزی کردار مانیکا گاندھی تھی۔ اگر وہ اپنے جذبات کی طرح اپنے حقائق کے لیے بھی نظم وضبط کا مظاہرہ کرتی تو اس کی پوزیشن مستحکم ہوسکتی تھی۔ اگر وہ انسان کی خوراک کا حصہ بننے والے ہر قسم کے جانور اور پرندوں کو ذبح کرنے کے خلاف صف آرا ہوتی تو میں ایک گوشت خور انسان ہونے کے باوجود اس کی پشت پناہی ضرور کرتا۔ لیکن گوشت کی بنی اشیا بیچنے والوں میں سے مخصوص کو نشانہ ہدف بنانا نہ تو حب الوطنی ہے اور نہ ہی دیانتداری۔

❖ O ❖

بوڑھوں کی سالگرہ

خوشحال اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے بیشتر ہندوستانی خاندان سالگرہ مناتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا تعلق نچلے درجے کے متوسط طبقے سے تھا اور ویسے بھی میرے زمانے میں تو والدین پیدائش کی تاریخ یاد رکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کیا کرتے تھے لہٰذا کبھی بھی ہمارے مستقبل کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ چنانچہ میری طرح کے کچھ لوگوں نے پارٹی منانے اور تحفے اکٹھے کرنے کے لیے ایک مناسب سی تاریخ چن رکھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سالگرہ کے دن خوشی منانے کے مواقع بن کر رہ گئے۔ اب جب میری ملاقات اپنے کسی ہم سن سے ہوتی ہے تو ہم عام طور پر ایک دوسرے کی صحت پر ہی تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ یہ گفتگو کچھ اس طرح کی ہوتی ہے۔ ''تم نے عینک لگا رکھی ہے' شیشوں کا نمبر کیا ہے؟'' (اس کا مطلب ہوتا ہے' کہیں تم اندھے تو نہیں ہوتے جا رہے ہو)

''کیا تمہیں سننے میں مشکل پیش آتی ہے؟ کہیں سننے والا آلہ تو استعمال نہیں کرتے ہو؟'' (اس سے مراد ہوتی ہے' کیا تم بہرے تو نہیں ہوتے جا رہے ہو)

''تمہارے منہ میں کتنے دانت باقی بچے ہیں۔'' (مطلب یہ کہ کیا تم مصنوعی دانت تو استعمال نہیں کر رہے ہو؟)

''کیا تمہیں رات کو پیشاب کرنے کے لیے اٹھنا پڑتا ہے؟'' مطلب یہ ہوتا ہے: Do you have an Enlarged prostrate?

پھر بلڈ پریشر، شوگر، دل وغیرہ وغیرہ کے متعلق وہی گھسے پٹے سے سوالات جو اس سوال سے جا ملتے ہیں کہ ہم اور کتنی دیر زندہ رہیں گے۔

یہ افسردہ خیالات اس وقت میرے ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں جب میں اپنی آنکھ کے آپریشن کے لیے (جس میں موتیا اتر آیا ہے) آپریشن تھیٹر میں داخل ہوتا ہوں۔ ڈاکٹر ناؤ شر شروف کے ساتھ طے کی جانے والی ملاقات سے ایک ہفتہ قبل میں نے اپنے ڈینٹسٹ اروِن کمار سے بھی بارہا ملاقات کی تھی۔ میں کمار کے پاس نہ جانے کی پوری کوشش کرتا ہوں کیونکہ وہ ہمیشہ میرے دانتوں میں سے خرابی نکالتا رہتا ہے اور میرے پان چبانے کی عادت پر مجھے نصیحتیں بھی صادر کرتا ہے۔ پھر یوں ہوا کہ میرے ایک نچلے دانت میں بری طرح درد ہونے لگتا ہے اور مجھے دو دن تک صرف مائع غذا پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ پہلی ملاقات میں اَرُون کمار نے متاثرہ دانت کا ایکس رے لے لیا تھا، اگلی ملاقات پر اس نے مجھے دکھایا کہ گھن پھیل گیا تھا اور نتیجتاً اُس نے میرے دو مزید دانت نکال دیے تھے۔ اب اصل بتیس دانتوں میں سے میرے پاس صرف چھبیس باقی بچے تھے۔ میں اپنی عمر کے بہت سے لوگوں سے بہتر ہوں۔ میری عمر کے لوگ خود کو اپنی عمر یاد دلانے کے لیے سالگرہ کا انتظار نہیں کرتے۔ بلکہ یہ کام ڈاکٹروں، دندان سازوں اور چشمہ سازوں کے بل ہمارے لیے سرانجام دیتے ہیں۔

ہندوستانی: ایک خوشامدی قوم

کیا ہم ہندوستانیوں میں دوسرے لوگوں کی نسبت خوشامد کرنے کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے؟ میرے خیال میں ہمارے بارے میں یہ کہا جانا سچ ہے لیکن میں کبھی بھی اس بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا کہ خوشامد کی جڑیں اتنی زیادہ کس طرح پھیل گئیں ہر کوئی چاہے وہ کچھ بھی ہے' اس کے ساتھ چمچوں کی ایک ٹولی موجود ہوتی ہے۔ یہ ''چمچے'' اپنے ہیرو کے ساتھ وابستگی کو اپنی عقیدت یا وفاداری کہتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ہر ادارے میں ہر کوئی اپنے سے بڑے افسر کی جی حضوری کرنے اور اپنے سے چھوٹے افسر سے جی حضوری کروانے میں مصروف نظر آتا ہے۔

سب سے بڑے افسر کا مقام دیوتا یا ان داتا جیسا ہوتا ہے۔ اس کے گرد چمچوں کی ایک ایسی منڈلی موجود ہوتی ہے جو اس کے حکم پر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ یہ منڈلی اپنے ساتھ دروازے پر پڑے جوتے صاف کرنے والے کپڑے کے ساتھ کیا جانے والا برتاؤ تک سہے گی' ان لوگوں کی سرعام سرزنش اور بے عزتی ہوگی لیکن ان کی اپنے افسر کے ساتھ یکطرفہ عقیدت میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ وہ اپنے ان داتا کی خدمت کریں گے' اس کے خاندان کی خدمت کریں گے' اس کے دوستوں کے ساتھ مہذب رویہ اختیار کریں گے' اس کے دشمنوں سے نفرت کریں گے اور اُس شخص کے ساتھ جسے وہ سراہتے ہیں' اپنی شناخت استوار کرنے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لائیں گے۔

اگر چہ خوشامد یا چاپلوسی تمام معاشروں میں پروان چڑھتی ہے لیکن ہندوستان میں اس کی جذباتی اور روحانی جڑیں زیادہ گہری ہیں۔ ہمارا آئین تیار کرنے والوں میں سے مرکزی کردار کے حامل بھیم راؤ امبید کر نے آئینی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستانی طرز زندگی میں چاپلوسی کے عنصر کا ادراک سے بھرپور تجزیہ پیش کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا: ''جہاں تک بھارت کا تعلق ہے تو بھگتی یا عقیدت کا راستہ یا پھر جسے کسی بڑے آدمی کی پرستش کرنا کہا جاتا ہے' اس ملک کی سیاست میں ایک ایسا کردار ادا کرتا ہے جو دنیا کے کسی بھی ملک کی سیاست میں ادا کیے جانے والے اس کردار کی اہمیت کے متوازی نہیں ہے۔ بھگتی مذہب میں تو شاید روح کی نجات کا راستہ ہو لیکن سیاست میں اس کا وجود یقینی طور پر ذلت کی طرف لے جاتا ہے اور بالآخر آمریت پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ بھگتی یقیناً عمومی رویوں کو غیر منصفانہ طور پر حقیقی ہیرو سے دور لے گئی ہے۔''

میرے خیال میں ڈاکٹر امبید کر کا کہنا درست تھا۔ پورے ہندوستان میں بھگتی کو نجات کا بہترین راستہ ہونے کے ناتے اتنی ہی مقبولیت حاصل تھی جتنی کہ اسلامی صوفی ازم کو حاصل تھی۔ یہ لوگ بھی بالکل اُسی طرح روحانی پیشوا کی مکمل اطاعت کرنے کی ضرورت پر زور دیتے تھے۔ یہی اطاعت سیکولر زندگی میں چاپلوسی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ گرو یا مرشد کو ''چیلے'' کا تن من دھن درکار ہوا کرتا تھا اور چیلے روحانی نجات کی جستجو میں یہ سب اپنے مرشد کو دے دیا کرتے تھے۔ آج کے دور میں دنیاوی کامیابی حاصل کرنے کے لیے چیلے اپنا سب کچھ وقف کر دینے کے اُسی جذبے کے ساتھ اپنا تن من دھن' اپنے افسران کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔

❖ ○ ❖

بوڑھے آخر کہاں جائیں؟

بڑھاپے کے اصل مسائل کیا ہوتے ہیں' یہ جاننے کے لیے آپ کا بوڑھا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ جس پر بیتتی ہے وہی جانتا ہے کہ اس مرض کے اسرار ورموز کیا ہیں۔

میں جسمانی یا ذہنی کمزوریوں کی بات نہیں کر رہا ہوں جو عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ سامنے آتی ہیں اور ان کے لیے مخصوص نوعیت کے علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ ہی میں بیٹے بیٹیوں یا پوتے پوتیوں کی اُس بے رُخی کا ذکر کر رہا ہوں جو اُن کے بوڑھے دادا دادی کے سٹھیائے ہوئے ہونے کی وجہ سے محسوس ہوتی ہے اور انہیں ہر وقت بک بک کرنے والے بوڑھے تکلیف دہ محسوس ہوتے ہیں۔ اور وہ سب ان کے اس دنیا سے چلے جانے کو ترجیح دیتے ہیں تا کہ ان کی زندگی سہل ہو سکے۔

میں ''Old People's Homes'' کے کم ہونے کا بھی شکوہ نہیں کر رہا ہوں جہاں بوڑھے افراد اپنی زندگی کے آخری دن معقول آسائش میں بسر کر سکتے ہیں اور سکون سے مر سکتے ہیں۔ دراصل میں عام لوگوں کی اُس سنگدلانہ بے اعتنائی اور عدم توجہی کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ جیسے یہ ان لوگوں کے ساتھ برتتے ہیں جو ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر مزید نہیں چل سکتے۔ میں آپ کو اپنی ذاتی زندگی میں سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' میں اور میری بیوی ہفتے میں کم از کم ایک شام اپنے ساٹھ سالہ دوست پریم کرپال کے ساتھ گزارتے رہے ہیں۔ وہ سڑک کے دوسری جانب

ہمارے گھر سے پچاس گز سے بھی کم کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ پانچ سال پہلے تک تو ہم سڑک کی درمیانی پٹی کو پھلانگتے ہوئے پیدل ہی چلے جایا کرتے تھے پھر یہی پٹی ایک رکاوٹ بن گئی۔ اس پر قدم رکھ کر چڑھنا ایورسٹ پر چڑھنے کے مترادف تھا اور دوسری جانب اس پر سے اترنا اس سے بھی زیادہ جوکھم والا کام تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ہم نے اس رکاوٹ کو ناکام بنادیا اور پٹی میں ایک ٹوٹی ہوئی جگہ تلاش کر لی۔ اب اگلی مصیبت سڑک پار کرنے کی تھی۔ پہلے ایک سمت سے آتی ہوئی ٹریفک کے بہاؤ میں مناسب وقفے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پھر دوسری سمت سے آتی ہوئی ٹریفک کے درمیان وقفے کا انتظار اور پھر جتنی تیزی سے ہماری ٹانگیں ہمیں پار لے جاسکتی تھیں اتنی تیزی سے لنگڑاتے ہوئے دوسرے کنارے پر پہنچنا بھی اس میں شامل تھا۔ اب پریم کرپال ہمیں پچاس گز کا سفر طے کرنے کے لیے اپنی گاڑی بھجوادیتے ہیں۔

مجھے ایک شعر یاد آرہا ہے:

جوانی جاتی رہی اور ہمیں پتا نہ چلا
اسی کو ڈھونڈ رہے ہیں کمر جھکائے ہوئے

ہمیں ایک اور مصیبت کا سامنا ہے جو کسی دوست کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے سے بھی زیادہ سنگین نوعیت کی ہے' گرمیوں کے مہینوں میں ہم دو تین مرتبہ کسولی جاتے ہیں۔ میں گاڑی خود چلا کر لے جایا کرتا تھا۔ پھر جی ٹی روڈ کی ٹریفک اور کالکا سے کسولی تک کے 22 کلومیٹر کا سفر طبیعت پر ناگوار گزرنے لگا۔ ہم چنڈی گڑھ تک ''ہمالیہ کی ملکہ'' میں سوار ہو کر اور پھر وہاں سے کسولی تک کار کے ذریعے سفر کرنے لگے۔ لیکن ہمیں ایک بار پھر معمولی سی وجہ کی بنا پر ''ہمالیہ کی ملکہ'' کو بھی ترک کرنا پڑا۔ کیونکہ یہ ٹرین دلی ریلوے سٹیشن کے مختلف پلیٹ فارموں سے آیا جایا کرتی تھی اور ان پلیٹ فارموں تک پہنچنے کے لیے لائنوں کے اوپر بنائے گئے پلوں کی سیڑھیاں چڑھنا اور اُترنا پڑتی تھیں۔ جلدی میں تیزی سے سیڑھیاں اترنے والے مسافروں کے ہاتھوں نیچے گرادیے جانے کے خطرے کے پیش نظر ہم سیڑھیوں سے نیچے اترنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ حالانکہ

اب ہم سابقہ پارلیمانی رکن ہونے کی وجہ سے مفت سفر کر سکتے ہیں۔ لیکن اس معمولی سی وجہ کی بنا پر ہم شتابدی ایکسپریس کے ذریعے تیرہ سو روپے فی کس خرچ کر کے سفر کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ گاڑی پلیٹ فارم نمبر 1 سے روانہ ہوتی ہے اور یہیں آ کر رُکتی ہے اور اس کے لیے ہمیں پلوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یعنی اب تو ٹرین پر سوار ہونا اور اُترنا ایک ڈراؤنا تجربہ بن چکا ہے۔ ہر کوئی ٹرین میں سوار ہونے یا اترنے کے لیے شدید بے تاب دکھائی دیتا ہے۔ دھکم پیل بوڑھے لوگوں کو گرا سکتی ہے اور ان کی کمزور ہڈیاں توڑ سکتی ہے۔ ٹرین کی نسبت ہوائی جہاز سے سفر کرنے میں معمولی سی آسانی ہے۔ مجھے عملے کے کسی بندے یا کسی تنومند ساتھی مسافر کو دستی بیگ اُٹھانے کے لیے درخواست کرنا پڑتی ہے۔ مجھے احساس ہی کہ میرے سفر کرنے کے دن تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ بوڑھے لوگ کیا کریں۔ کہاں جائیں؟ ون پرستھا (جنگل بسیرا) ہی ہماری مقدس کتابوں میں اس کا علاج تجویز کیا گیا ہے اور اب میں اس نتیجے پر پہنچتا جا رہا ہوں کہ یہ علاج ٹھیک ہی تھا۔

مذہب کا نخلستان

جس طرح ہمارے ملک میں آج مذہب پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس سے میری شکایت یہ ہے کہ مذہب کوئی سماجی خدمت سرانجام نہیں دیتا ہے۔ اکثر و بیشتر اس کا کردار غیر سماجی ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف عقیدوں کے پیروکاروں کے مابین اختلاف کی وجہ بھی ہوتا ہے۔ یہ ایسے بہت سے مسائل کو حل کرنے میں ایک مثبت قوت ثابت ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے ہمارے ملک کا ناک میں دم کر رکھا ہے اور اسے ایسا ہونا بھی چاہیے۔ لیکن یہ ابھی تک ہمیں دقیانوسی اور بے بنیاد توہمات میں جکڑ کر مسلسل منفی کردار ادا کرنے میں مصروف عمل ہے۔ اپنی بہترین حالت میں پہنچ کر یہ ایک ایسے کھیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو بھجن گانے' تقریریں کرنے' چلے کاٹنے' زیارتوں اور جلوسوں میں وقت ضائع کرنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ یا پھر ساری رات جاگنے اور اکھنڈ پاٹھوں جیسی رسوم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کیا ان سے سماجی حالات میں بہتری آتی ہے؟ کیا یہ لوگوں کو بہتر انسان بناتے ہیں؟ دونوں سوالوں کا جواب ہے: ''نہیں''۔

میرے نزدیک تو صرف ایک ایلا بھٹ (SEWA کی بانی) ہی نے ہندوستان کی عورتوں کے لیے اتنی زیادہ خدمت سرانجام دی ہے جو ٹی وی چینلوں پر دھواں دار تقریریں کرتے ہوئے دکھائی دینے والے تمام گروؤں اور درویشوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک مدر ٹریسا کی قدر و منزلت پورے ہندوستان میں پائے جانے والے تمام

کیتھولک چرچوں کے پادریوں سے زیادہ ہے کیونکہ وہ ان لاکھوں لوگوں کی زندگی میں امید لے کر آئی جو ہمت ہار بیٹھے تھے۔ صرف ایک پورن سنگھ (پنگل وارا کا بانی) نے مفلسوں اور ذہنی طور پر اپاہج لوگوں کی پانچ تختوں کے جتھے داروں سے زیادہ مدد کی تھی۔ ہمیں کیسری چولوں میں ملبوس ان مرد وزن کی نسبت جو باتوں کے سوا کچھ نہیں کرتے ہیں ایلا بھٹ مدر ٹریسا اور پورن سنگھ جیسے لوگوں کی زیادہ ضرورت ہے۔

بالآخر مذہبی جوش و خروش کو ملک کی بہتری کے لیے استعمال میں لانے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس کا آغاز آنند پور کے مقام پر بیساکھی کے موقع پر ہوا تھا۔ پرساد (حلوہ) کے علاوہ زائرین کو اپنے صحن اور باغوں میں لگانے کے لیے ان کی پسند کے پودں کی پنیری بھی دی گئی تھی۔ دہلی میں اس نئے طریقے کی پیروی کی گئی ہے۔ جسٹس (ریٹائرڈ) آر۔ ایس نرولا، رجبیر سنگھ (چیئر مین) اور پشپندر سنگھ (سیکریٹری) کی سرپرستی میں ایک تنظیم ''سرب سانجھا خالصہ'' نے تین گردواروں کے احاطوں میں نرسریاں قائم کی ہیں جہاں سے ہر کوئی حالیہ مون سون کے موسم میں لگانے کے لیے مفت پودے لے جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا کار خیر ہی جسے چپکو تحریک کے سُندر لال بہوگن، بشنوئی اور دوسرے ماحولیات دان فوری طور پر اپنا سکتے ہیں۔ اس سال کے ''ون مہتسوا'' (موسم شجرکاری) کو سیاستدانوں کی تشہیر کے لیے سرکاری موقع بنانے کی بجائے ہندوستان کو سرسبز بنانے کے لیے عوامی تحریک بنا دینا چاہیے۔

چوتھا حصہ

شخصیات اور احوال وکوائف

جدید ہندوستان کا معمار

ہندوستانی اخبارات کی جانب سے راجا رام موہن رائے کو پیش کیے جانے والے خراج تحسین کی تان بھی اسی گھسے پٹے جملے پر آ کر ٹوٹی جسے ہم موجودہ درسی کتابوں میں پڑھ پڑھ کر اکتا چکے ہیں یعنی ''جدید ہندوستان کے معمار''۔ اسے میری خوش قسمتی سمجھیے کہ مجھے ان کی شخصیت کے متعلق جسٹس داس، ایم۔ آر۔ بیگ اور ائیر چیف مارشل لعل کی زبانی بہت سی مزید اہم باتوں کے جاننے کا شرف حاصل تھا۔ یہ لعل ہی تھے جنہوں نے راجا کی زندگی کے بے شمار پہلوؤں پر توجہ دلائی تھی۔ کیا آپ لوگوں نے کبھی غور کیا ہے کہ ان کی بسر کردہ زندگی ہمارے زمانے کی نسبت شہنشاہ اورنگزیب کے زمانہ حکومت سے زیادہ قریب تھی؟ اور جب ان کے ہمعصر یعنی پیشوا اور مہاراجا رنجیت سنگھ وغیرہ ابھی توڑے دار بندوقوں اور تلواروں سے جنگیں لڑ رہے تھے تو اسی دوران رام موہن جی آزادی صحافت، عدالت عظمیٰ میں ہندوستانیوں کی نشستوں کے حقوق، پاسپورٹوں کو ختم کرنے کی ضرورت اور ہندوستانی خواتین کے لیے جائیداد کے حقوق جیسے موضوعات پر اعلیٰ نثری پیرائے میں یادداشتیں مرتب کرنے میں مصروف تھے؟ کیا آپ کو علم تھا کہ رام موہن جی گیارہ زبانوں پر عبور رکھتے تھے جن میں سنسکرت، بنگالی، ہندی، اردو، فارسی (فارسی زبان میں انہوں نے ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا)، عربی، عبرانی، شامی، یونانی، انگریزی اور فرانسیسی شامل تھیں؟ اگرچہ انہوں نے انگریزی زبان 24 سال کی عمر میں سیکھنا شروع کی تھی لیکن صرف پانچ سال بعد

وہ اس زبان میں اس قدر مہارت حاصل کر چکے تھے کہ ان کی یہ مہارت جرمی بنیتھم (Jermy Bentham) سے بھی داد پا چکی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ راجا کے لکھے ہوئے خطوط کسی ''اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز'' کے لکھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

بے شک یہ شخصیت غیر معمولی ذہانت کی مالک تھی! میرے ذہن میں تو ایسی کوئی بھی زندہ یا گزر جانے والی شخصیت نہیں ابھرتی ہے جو راجا رام موہن رائے کے کارہائے نمایاں کا مقابلہ کر سکے۔ یہ بات اس لیے غیر معمولی نوعیت کی ہے کیونکہ رام موہن رائے کی تعلیم نہایت معمولی اور زندگی ناخوشگوار تھی۔ وہ اپنے والد کے ساتھ مسلسل بحث میں مبتلا رہ چکے تھے۔ دوران گفتگو ان کا پسندیدہ لفظ ''کنتو'' (لیکن) تھا۔ ان کی والدہ نے انہیں حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کیا تھا۔ ان کی بیویاں (بچپن میں انہیں تین خواتین کے ساتھ بیاہا گیا تھا) ان سے دور رہی تھیں جبکہ مذہبی طور پر کٹر جماعت دھرم سبھا نے انہیں بارہا قتل کرنے کی کوششیں کی تھیں۔

ان تمام مشکلات میں سے کوئی بھی مشکل رام موہن کو اپنے مشن پر ایمان رکھنے سے متزلزل نہیں کر پائی تھی۔ انہوں نے بت پرستی، رسوم اور مافوق الفطرت عنصر کی بنا پر مذہب سے کنی کترانے والے ایسے ہندوستانیوں کے لیے جو سوچ وبچار پر یقین رکھتے تھے برہمو سماج میں ایک مذہب تشکیل دیا تھا۔ یہ عمل مشہور شاعر براؤننگ کے قول کی یاد دلاتا ہے: ''اب خدا کی عدالت سے بڑی ایک عدالت اور بھی موجود ہے اور وہ ہے پڑھے لکھے انسان کی عدالت۔'' راجا کی جانب سے پرنس تیلیرنڈ (Prince Talleyrand) کو لکھا جانے والا خط اس کے عقیدے کو زیادہ جامع طور پر پیش کرتا ہے: ''صرف مذہب ہی نہیں بلکہ غیر متعصبانہ قسم کی معمولی فہم وفراست اور درست سائنسی تحقیق ہمیں اس نتیجہ پر لے جاتی ہے کہ تمام نسل انسانی ایک عظیم خاندان کی مانند ہے اور لاتعداد قومیں اور قبیلے محض اس کی شاخیں ہیں۔'' یہی وہ بات تھی جسے بعد میں ٹام پائین نے دہرایا تھا کہ ''دنیا میرا ملک، بنی نوع انسان میرے بہن بھائی اور اچھا عمل میرا مذہب ہے۔''

رام موہن نے روایتی عقائد پر حملہ کرتے رہنے اور اسلام اور عیسائیت کی آمیزش کے باوجود ہندومت کے ساتھ اپنی وفاداری کو کبھی نہیں بھلایا تھا۔ جب وہ

انگلستان تشریف لے کر گئے تو اپنے براہمن باورچیوں کو ساتھ لے کر گئے تھے (دو ہندوستانی گائیوں کو بھی) کومہ کی حالت میں جانے سے پہلے جو آخری الفاظ انہوں نے ادا کیے وہ ''ہری اوم'' تھے۔ ان کی تدفین ان کے جنیو یعنی مقدس دھاگے سمیت ہوئی تھی۔

زندگی کے تمام پہلوؤں پر جن میں سیاسی' سماجی' معاشی' مذہبی' ادبی اور ثقافتی پہلو شامل ہیں انہوں نے اپنی شخصیت کے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ مہاتما گاندھی نے انہیں ''بونا'' کیوں کہا تھا؟ تاریخ کے کسی بھی طالب علم کے لیے یہ بات واضح ہے کہ رام موہن رائے ہندوستان کے عظیم سپوتوں میں سے ایک تھے۔ ٹیگور کا گاندھی جی کو دیا جانے والا فوری جواب بالکل ٹھیک تھا۔ ٹیگور نے راجا کو ''عظیم فہم وفراست کا مالک اور ایک کھلے دل والا شخص'' بیان کیا تھا۔

راجیو گاندھی! ایک بے قرار پاک دامن

میڈیا کے لوگوں نے بڑی محنت سے راجیو گاندھی کے ''مسٹر کلین'' ہونے کا تاثر قائم کیا ہے کیونکہ اس بات میں صداقت کا مضبوط عنصر بھی پایا جاتا ہے' اس لیے یہ خطاب اس کے ساتھ چپک چکا ہے۔ جیسا کہ سیاست دانوں کا کہنا ہے کہ وہ شفاف ترین سیاسی آوازوں میں سے ایک آواز ہے۔ اس کی شفاف ایمانداری قابل یقین ہے۔ وہ ایک مہذب اور شریف النفس شخص ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی موجودگی نہایت اثر آفریں ہوتی ہے۔ تاہم اس کے جاذب نظر چہرے پر چند ایک داغ ابھرنے لگے ہیں۔ ان داغوں میں سے ایک گہرا داغ ایسے بیانات جاری کرنے کی عادت کا ہے جس سے بعد میں صلاح مشورہ کرنے پر اسے منحرف ہونے کے لیے باصرار کہا جاتا ہے۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے اس نے سیاست دانوں انتہائی روایتی حربہ استعمال کر رکھا ہے یعنی یہ کہہ دینا کہ ''مجھے ٹھیک طرح سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔''

میں نے اس کے غلط سماجی اقدامات کی اب تک کوئی فہرست تیار نہیں کی ہے لیکن میں مستقبل میں ایسا کرنے کا ارادہ ضرور رکھتا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان غلط اقدامات میں سے کچھ تو پہلے ہی ریکارڈ پر آ چکے ہیں اور انہیں تاریخ کے صفحات سے مٹانا کافی مشکل ہوگا۔ کیا اس نے بھنڈراں والا کو جب وہ زندہ تھا ایک خالص مذہبی رہنما کہا تھا یا نہیں' اور پھر اس کے مر جانے کے بعد کبھی ایسا کہنے سے انکار کیا تھا یا نہیں؟ کیا اس

نے ایسا نہیں کہا تھا کہ آپریشن بلیو سٹار کے دوران 700 سے زائد جوان مارے گئے تھے جبکہ حکومتی وائٹ پیپر میں مرنے والے فوجی جوانوں کی تعداد صرف 92 درج تھی؟ کیا اس نے ایم جے اکبر سے خود یہ پیمان نہیں باندھا تھا کہ وہ پنجاب میں ہونے والے تشدد کے واقعات اور جنوبی ہندوستان میں سکھوں کے قتل عام اور پھر اس کے بعد ہونے والی منظم قتل و غارت کے معاملے کی عدالتی تحقیقات کروائے گا؟ راجیہ سبھا میں جب میں نے اسے یہی وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی اور اس کے سامنے ''سنڈے'' کا وہ شمارہ رکھا جس میں اس کا انٹرویو چھپا تھا تو اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ ''میں نے چھپا ہوا انٹرویو نہیں پڑھا ہے لیکن جو میں نے کہا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔'' جب میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ اس نے 10 مارچ 1985 سے پہلے اعلان کرنے کا وعدہ کیا تھا تو اس پر اس نے کہا: ''بہر حال' آج تو 16 مارچ ہے۔'' اس قسم کا جواب کسانوں کی پنچایت میں واقعی قہقہے بکھیر سکتا تھا لیکن راجیہ سبھا میں بھی صورتحال کچھ مختلف نہ تھی کیونکہ کانگریس کے عہدیداروں نے اسے دندان شکن جواب تصور کرتے ہوئے دل کھول کر داہ داہ کی تھی۔ اور اب اس نے کانگریس پارلیمانی پارٹی کو بیان جاری کیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ جلد ہی پنجاب سے فوجیں واپس بلالی جائیں گی' انتخابات منعقد کیے جائیں گے اور ایک منتخب حکومت لائی جائے گی۔ اس بیان کو اخبار والوں کے سامنے راجیہ سبھا میں پارٹی کے نہایت زندہ دل سیکرٹری جے۔ کے۔ جین نے دہرایا اور پھر چند ہی منٹ بعد پارٹی کے جنرل سیکرٹری سری کانت ورما نے اس بیان کی سختی سے تردید کر دی۔ پہلے تو یوں لگا کہ جیسے جے۔ کے۔ جین کو بیوقوف بنایا گیا تھا اور پھر یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے سری کانت ورما نے ممکنہ جھگڑے کو روکنے کے لیے پریس کو وہی بتایا تھا جو انہیں ان کے رہنما نے کہا تھا۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ جو کچھ راجیو گاندھی نے کہا تھا اسے جے۔ کے۔ جین نے نہایت وفاداری سے بیان کر دیا تھا لیکن راجیو اپنے لفظوں کے سلسلے میں محتاط رویہ اختیار نہیں کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ''مسٹر کلین'' کی بجائے جلد ہی ایک نیا عرف عام حاصل کر لے گا اور وہ ہے: ''مسٹر کنفیوزڈ۔''

❖ ○ ❖

فلورا کون تھی؟

موجودہ نسل کے بہت سے لوگ فلورا اینی سٹیل (Flora Annie Steel) کے نام سے واقف نہیں ہوں گے جبکہ ایسے لوگوں کی تعداد انتہائی کم ہو گی جنہوں نے اس کی لکھی ہوئی کوئی ادبی تحریر پڑھ رکھی ہو گی۔ ٹل رُڈیارڈ کپلنگ (Till Rudyard Kipling) نے اس کی شہرت کو معدوم کر دیا تھا۔ یہ خاتون ہندوستان پر لکھے جانے والے ادب کی نمایاں ادیبہ تصور کی جاتی تھی۔ تاہم اس کا ناول (On the face of the waters) کپلنگ کی شہرت کے سیلاب کی نذر ہونے سے بچ گیا اور اسے اب بھی بغاوت کے موضوع پر ادب کی حتمی کاوش سمجھا جاتا ہے۔ یہ ناول اپنے زمانے کا بیسٹ سیلر تھا اور اس نے وکٹورین عہد کے انگلستان میں فلورا کو ادب کی شیرنی بنا دیا تھا۔ فلورا ولبسٹر 1847ء میں ہیرو (Harrow) کے مقام پر پیدا ہوئی اور 82 سال کی عمر میں 1929ء میں انتقال کر گئی۔ اپریل کے پہلے دو ہفتوں میں سے کسی دن اس کا جنم دن اور برسی منائی جاتی ہے۔

فلورا نے اپنی شادی شدہ زندگی (اس کے شوہر ہنری سٹیل آئی سی ایس میں تھے) کا 20 سال سے بھی طویل عرصہ جنوبی ہندوستان زیادہ تر پنجاب میں بسر کیا تھا۔ ابھی اس کی عمر 20 سال بھی نہ تھی جب اس نے ہنری کی جانب سے بھجوائی جانے والی شادی کی پیشکش قبول کر لی تھی۔ اس بات کا اعتراف اس نے بعد میں کیا کہ اسے کبھی بھی اپنے خاوند سے محبت نہیں رہی تھی اور اس کے جسمانی ملاپ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کی وجہ یہ تھی

کہ بیوی ہونے کے ناطے اسے یہ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اس نے ایک جگہ لکھا تھا: ''میری پیڑھی کی ایسی بہت سی خواتین جنہیں جہالت کے اندھیروں میں رکھا گیا ہے انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ ان کے ہنی مون خوف میں گھرے ہوئے اور آنسوؤں میں بھیگے ہوئے تھے۔''

''میرا ہنی مون ایسا نہیں تھا میں صرف آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہتی تھی۔ اگر چہ رونما ہونے والے قدرتی واقعات سے جس قدر میں نا آشنا تھی اتنا دنیا کا کوئی اور بچہ نہیں ہوسکتا ہے لیکن میں نے یہ سب کچھ انسانیت اور اس دنیا کی عظیم پر اسراریت کا اجنبی سا حصہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ جبکہ زندگی کے حقائق سے پیدا ہونے والی میری بدمزگی کی کیفیت کو ''سمجھنے'' کی اسی خواہش نے زیر کر لیا تھا۔''

مسز سٹیل 1868 کے موسم گرما میں مدراس پہنچے اور ٹرین کے ذریعے دلی کا قصد کیا جو اس وقت ریل کا ٹرمینل تھا۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی نے مل کر گھوڑے اور پالکی کے ذریعے لدھیانے تک کا سفر کیا جہاں فلورا کے خاوند کی پہلی تعیناتی ہوئی تھی۔ 'کسوڑ' جسے آنے والے کئی سالوں کے لیے اس کا گھر اور صحیح معنوں میں ہندوستان اور ہندوستانیوں سے رابطے کا باعث بننا تھا وہاں جانے سے پہلے اس نے چند ماہ کسولی میں گزارے۔ کسوڑ ہی وہ جگہ تھی جس نے اسے اپنی لاتعداد کہانیوں کے مجموعوں اور ناولوں کے لیے مواد فراہم کیا تھا۔

فلورا کے ادبی کام کا تھوڑا بہت مطالعہ جو میں نے کر رکھا ہے (اس کے ناول Mutiny سمیت جسے میں ختم نہیں کر پایا تھا) اس نے مجھے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ اس کے پلاٹ الجھے ہوئے اور جتن کر کر کے بنائے گئے ہیں' کردار حقیقی نہیں لگتے ہیں جبکہ اس کا اسلوب نہایت بوجھل ہے' تاہم جس بات نے مجھے اس کی تحریروں سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ اس کے چھوٹے قصبوں کی خواتین کے ساتھ مل کر سرانجام دیئے جانے والے کام تھے جن کے بارے میں وائلٹ پاؤل نے اس کی سوانح عمری میں کافی کچھ لکھا تھا۔ یہ امر اس بات کا مظہر ہے کہ کس طرح فرسودہ خیالات کی مالک ایک شخصیت (فلورا کپلنگ کے ''اعلیٰ نسل'' کے نظریات کی تائید کرتی تھی) ان لوگوں کے دکھ درد میں کمی لاسکتی ہے جن کے ساتھ اس کی بہت تھوڑی ذاتی اقدار مشترک تھیں۔ وہ بہ نسبت ہندوستانیوں کے جن کے درمیان وہ رہتی تھی اپنی پالتو گلہریوں اور کتوں کے زیادہ قریب تھی۔ اپنی استاد وہ خود ہی تھی' اس نے طب کی شدھ

بدھ سے آغاز کیا اور ترقی کرتے ہوئے ''مہتمم مدرسہ جات'' کے عہدے تک پہنچی۔ اس نے اپنی مختصر سی سلطنت پر آہنی ہاتھوں سے حکمرانی کی تھی۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ کسی بھی ایسے فرد کو اپنے کوڑے سے پیٹ سکتی تھی جو میم لوگوں کے متعلق تحقیر آمیز کلمات ادا کرنے کا قصوروار ہوتا تھا۔ اور تو اور وہ حکومتی سیکرٹریٹ میں جا گھستی اور اعلیٰ عہدیداروں کو زبانی کلامی زدوکوب کر ڈالتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جہاں بھی گئی وہاں اس نے لڑکیوں کے لیے سکول کھولے اور عورتوں کو اپنا برقع اتار پھینکنے پر اکسایا۔ جب اس نے کسوڑ کو خیر آباد کہا تو قصبے کی عورتوں نے اسے الوداعی تحفے کے طور پر ایک ایسا جڑاؤ پن پیش کیا جو انہوں نے اپنے ہاروں اور کنگنوں میں سے موتی اور قیمتی پتھر نکال کر بنایا تھا۔ فلورا شکرانے کی الوداعی تقریر کرنے میں ناکام رہی کیونکہ اس کی بجائے اس کے آنسو یہ فریضہ ادا کر رہے تھے۔

ہندوستان پر لکھی جانے والی فلورا اینی سٹیل کی زیادہ تر کتابیں اس کے واپس چلے جانے کے بعد انگلستان میں لکھی گئی ہیں۔ ''On the face of water'' اور لکھنؤ پر لکھے جانے والے ناول ''Vioce in the night'' کا مواد اکٹھا کرنے کے لیے وہ دوبارہ دو مرتبہ ہندوستان واپس آئی تھی۔ ان دیہاتی عورتوں سے ملنے کی خاطر جنہوں نے اس کے اوائلی دنوں میں اس سے دوستی نبھائی تھی اس نے چند ماہ کسوڑ میں بیتائے تھے۔ ناول ''بغاوت'' (Mutiny) کی کامیابی کے بعد ملنے والی مقبولیت سے اس نے مکمل طور پر لطف اٹھایا تھا (اس ناول کو اس کے پہلے پبلشر نے مسترد کر دیا تھا) ان مفلس ہندوستانی عورتوں کے لیے مزید روپیہ اکٹھا کرنے کی خاطر جنہیں وہ جانتی تھی' اس نے ہندوستانی معاملات میں اپنی دلچسپی کو برقرار رکھا تھا۔ 80 سال کی عمر کو پہنچ جانے کے باوجود اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں باقاعدہ کلاسوں میں شرکت کی تھی۔ اس کی آخری خواہش یہ تھی کہ اس کے جسم کو اس کفن میں لپیٹ کر نذر آتش کیا جائے جسے سکول کی ان بچیوں نے کاتا بُنا تھا جنہیں اس نے لاہور میں تعلیم دی تھی۔ 56 سال پہلے 12 اپریل 1929ء کو اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

❖ O ❖

اور ہی علی

میرے پاس کچھ ایسے واقعات محفوظ ہیں جو مولانا محمد علی جوہر کی حاضر جوابی کی دلیل ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی شوکت علی بھی آپ ہی کی طرح حاضر جواب شخصیت تھے اور اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے بڑے بھائی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ مولانا کے ایک اور سب سے بڑے بھائی ذوالفقار علی بھی تھے۔ مولانا جوہر اور ذوالفقار گوہر کچھ نہ کچھ شاعری میں کہا کرتے تھے جبکہ شوکت علی پر شاعری کی روح اثر انداز نہیں ہو پائی تھی۔ ایک دوست نے انہیں بات چھونے کی کوشش کی کہ ''آپ کے بڑے بھائی ذوالفقار 'گوہر' کے تخلص سے اشعار کہتے ہیں جبکہ مولانا اپنا تخلص ''جوہر'' رکھتے ہیں۔ آپ کا تخلص کیا ہے؟

مولانا شوکت علی نے جواب میں فوراً کہا جی میرا تخلص ہے:

''شوہر!''

جلال زکریا نے ہی جنہوں نے مجھے یہ واقعہ لکھ کر بھیجا تھا مولانا شوکت علی کی تحریک خلافت کے دوران مہاتما گاندھی کے ساتھ قربت اور پھر اس کے فوراً بعد علیحدہ ہو جانے کے متعلق ایک اور واقعہ لکھ بھیجا ہے۔

گاندھی جی اکثر خلافت کے پلیٹ فارم سے ہونے والے جلسوں سے خطاب کیا کرتے تھے۔ سامعین جن کی اکثریت مسلمان افراد پر مشتمل ہوا کرتی تھی یہ جاننا چاہتی تھی کہ

خلاف جو صرف مسلمانوں کا معاملہ تھی اس کے لیے ایک ہندو بنیا اپنی جان کیوں ہلکان کر رہا تھا۔ دراز قد اور مضبوط جسم کے مالک ہونے کی بنا پر مولانا شوکت علی گاندھی جی کو کچو کے لگایا کرتے تھے: ''ایک چھوٹا سا آدمی ہے میں نے اس کو اپنی جیب میں رکھا ہوا ہے۔''

بعد میں شوکت علی نے کانگریس چھوڑ دی' مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور ہر عوامی جلسے میں اہتمام سے یہ فقرہ دہرانے لگے کہ'' کہاں ہے وہ مہاتما گاندھی جس نے ہم مسلمانوں کو ہمارا حق دلانے کا وعدہ کیا تھا؟'' اپنی دعائیہ مجلسوں میں سے ایک کے دوران مہاتما نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: ''مولانا یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں کہاں ہوں؟ وہ تو کہا کرتے تھے کہ مجھے انہوں نے اپنی جیب میں رکھا ہوا ہے۔ ان سے کہو کہ اپنی جیب میں جھانکیں میں انہیں وہیں نظر آ جاؤں گا۔''

علامہ اقبال اور پاکستان

آیا اقبال نے ایک علیحدہ اور خود مختار مسلم ریاست کے تصور کی ترویج کی تھی' اب یہ بات محض علمی قیاس آرائی ہے۔ پاکستان ایک اٹل حقیقت ہے اور ہم اس کی سالمیت کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن اقبال کے لاکھوں مداح اب بھی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ علیحدگی کے موضوع پر ان کا کہنا کیا تھا۔ میرے نزدیک اس بات کو جاننے کی کوشش کرنا اور پھر انہیں قوم پرست' بین الاقوام پرست' کمیونسٹ یا فرقہ پرست کے ناموں سے منسوب کرنا بے کار بات ہے۔ وہ تضادات سے بھرپور شخصیت تھے لیکن دوسرے عظیم شاعروں کی طرح انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اس میں جذباتی طور پر نہایت پرجوش تھے۔

ہریانہ کے حالیہ گورنر ایس۔ ایم۔ ایچ برنی نے اپنی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''Iqbal: Poet-Patriot of India'' میں ایک مکمل باب صرف یہ بات ثابت کرنے کے لیے مختص کیا ہے کہ اقبال نے علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کے نظریہ کی حمایت نہیں کی تھی بلکہ متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے ایک ایسی خود مختار ریاست کی تجویز پیش کی تھی جو پنجاب' سندھ' سرحد اور بلوچستان پر مشتمل ہوتی۔ یہ 1930ء کی بات ہے' اس کے پانچ سال بعد جب چودھری رحمت علی نے اپنی تجویز پیش کی اور ''پاکستان'' کے نام کا سکہ اچھالا تو اقبال اور جناح دونوں نے اسے من گھڑت قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ رحمت علی کے اس تحقیقی مجلے کی اشاعت سے کچھ عرصہ قبل اقبال نے کلکتہ کے رہنے

والے ایک نوجوان مسلم لیگی رہنما راغب احسان کو لکھا تھا کہ ''میں متحدہ ہندوستان میں ایک مسلم صوبہ بنانے کی تجویز پیش کرتا ہوں۔'' اس وقت تک انہوں نے صرف جنوبی علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت کے متعلق سوچا تھا اور یہ ان کے ذہن میں نہیں تھا جو بعد میں مشرقی پاکستان بن گیا تھا۔ یہ بات بھی اقبال کے حق میں جاتی ہے کہ جناح کے برخلاف انہوں نے غیر مسلموں کو بھی کمتر تصور نہیں کیا اور اگرچہ انہوں نے لفظ قوم کا استعمال مختلف طبقات کو بیان کرنے کے لیے کیا تھا لیکن یہ ان معنوں میں ہرگز نہیں تھا جن معنوں میں اس کا استعمال بعد میں کیا گیا تھا یعنی اس کا اشارہ ان لوگوں کی طرف نہیں تھا جنہیں اپنے لیے علیحدہ ریاستیں درکار تھیں۔ پاکستان بنانے کے تقاضے پر مشتمل مسلم لیگ کی قرارداد علامہ اقبال کی وفات کے دو سال بعد منظور کی گئی تھی۔ اس قرارداد نے کے۔ کے عزیز (The Making of Pakistan) جیسے محقق کو یہ بات کہنے پر مجبور کیا کہ ''یہ پاکستانی قومیت کی ان داستانوں میں سے ایک داستان تھی جو اقبال پر پاکستان کی سرپرستی کا بوجھ ڈالنے کے لیے گھڑی گئی تھی۔

ان تمام باتوں میں سے کوئی بھی بات مجھے صحیح معنوں میں قائل نہیں کر سکی ہے میں اقبال کے کلام میں سے ایسے لاتعداد مصرعوں کی نشاندہی کر سکتا ہوں کہ جن میں مسلمانوں کو باقی لوگوں سے بہتر اور منتخب شدہ کہا گیا ہے۔ بت شکنی اور تلوار کے زور سے اسلام پھیلانے کو درست قرار دیا گیا ہے۔ تاہم یہ سب کچھ جس طرح فرسودہ روایات کہتی ہیں نہ یہاں پر پایا جاتا ہے اور نہ ہی وہاں پر (ہندوستان اور پاکستان میں)۔ یہاں تک کہ جب نواب آف بھوپال بھی ان کے اسلوب کے قصیدے پڑھتے ہوں:

جس کھیت سے میسر نہ ہو دہقاں کو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!

تو پھر تو وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے عظیم قصیدہ خواں ہیں۔

میں اقبال کے تمام مداحوں کو برنی کی یہ چھوٹی سی کتاب مطالعہ کے لیے تجویز کرتا ہوں۔ اس کتاب میں سیدہ حمید کے تراجم کے ساتھ اصل متن کی بھی رومن رسم الخط کے ذریعے بھرپور طریقے سے وضاحت کی گئی ہے۔

❖ ○ ❖

گنٹر گراس اور کلکتہ

پچھلے مہینے مجھے ایک جرمن رسالے کے ایڈیٹر کا فون آیا۔ ایڈیٹر صاحب مجھ سے ''گنٹر گراس ہندوستان میں'' کے زیر عنوان ایک مضمون لکھنے کا کہہ رہے تھے۔ یہ واقعہ 'گنٹر اور اس کی بیوی اُتی' سے میری ایک ڈنر پارٹی پر ہونے والی طویل ملاقات سے اگلے دن کا ہے جس کے ایک روز بعد ہی انہیں ہندوستان سے واپس روانہ ہو جانا تھا۔ اس کے دونوں میزبان' مغربی جرمنی کے سفیر شوئیڈل اور میکس ملر بھون کے ڈائریکٹر انگوروٹ نے میری خاطر ایک انٹرویو کے اہتمام پر بھی لاچارگی کا اظہار کر دیا تھا۔ اگرچہ گراس پورے ملک میں درجنوں صحافیوں سے بات چیت کر چکا تھا لیکن اس مقصد کے لیے صحافیوں کو یہ ظاہر کرنا پڑا تھا کہ وہ فقط دوستانہ گپ شپ کے لیے آئے تھے۔ اس نے اپنے متعلق چھاپے کا برا کبھی نہیں منایا تھا لیکن جونہی کوئی صحافی ٹیپ ریکارڈر یا ایک عدد نوٹ بک نکالتا تو اسے نہایت نرمی مگر مضبوط لہجے میں کھسک جانے کا کہہ دیا جاتا تھا۔

میرے پاس سوائے گراس کے نقش قدم پر چلنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا یعنی ان لوگوں سے ملاقات کی جائے جن سے وہ مل چکا تھا اور اس کے ہندوستان کے تیسرے مہماتی دورے کو ایک بار پھر سے تازہ کیا جائے۔ اس نے چھ ماہ کلکتہ میں گزارے اور مدراس' حیدرآباد' پونا' بمبئی اور کلکتہ گیا۔ میرے لیے وقت کی جو حد بندی تھی اس کے پیش نظر مجھے نہ تو ان تمام جگہوں پر جانے کا موقع مل پایا اور نہ ہی آدھ درجن سے زائد ان

لوگوں سے ملاقات ممکن ہو سکی جنہوں نے اس کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ جن لوگوں سے میں مل نہیں پایا تھا ان میں سے ایک بنگلہ دیشی شاعر داؤد حیدر بھی تھے جو کلکتہ میں اس کے ہمراہ تھے۔

''حالیہ دورۂ ہندوستان نے گنٹر گراس کو کچھ کر ڈالا ہے۔'' یہ میری خدمات حاصل کرنے والے ایڈیٹر کا کہنا تھا: ''پتا لگانے کی کوشش کرو کہ یہ چکر کیا ہے؟''

اس ایک داستان کو تو میں بذاتِ خود غلط ثابت کر سکتا ہوں جو یہ ہے کہ گنٹر گراس کو کسی بھی دوسرے شہر کی نسبت کلکتہ سے زیادہ محبت ہے۔ یہ داستان سراسر کلکتہ کی اپنی پیداوار ہے اور اسے شہر کے ان صاحبانِ علم نے یہ نکتہ استوار کرنے کی شدید جستجو میں پھیلایا ہے کہ کلکتہ میں کچھ ایسا ہے جو ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں نہیں پایا جاتا ہے یعنی آرٹ، ادب، موسیقی وغیرہ وغیرہ۔ گراس اپنے ناول (The Flounder) میں شہر کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے: ''ٹوٹا پھوٹا، بھیڑ سے بھرا شہر، ایک ایسا شہر جو اپنا ہی فضلہ کھا جاتا ہے، کلکتہ میں تنگ و تاریک گلیاں یا بستیاں دکھائی نہیں دیتی ہیں کیونکہ یہ شہر ہی ایک تنگ و تاریک گلی یا بستی جیسا ہے۔'' اسی ناول میں چند صفحوں بعد پھر ایک جگہ لکھتا ہے: ''یہ شہر ایک ایسا فضلے کا ڈھیر ہے جو خدا نے پھینکا اور اسے کلکتہ کا نام دے دیا۔ یہ کس طرح سے بدبو خارج کرتا ہوا، بھیڑ بھاڑ بڑھاتا ہوا قائم ہے اور پھیلتا چلا جا رہا ہے ہمیں ایک بھی مزید لفظ کلکتہ پر ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کلکتہ کا نام تمام 'رہنمائے سیاحت کتابچوں' میں سے مٹا ڈالیے۔'' مصنف کو جس شہر سے محبت ہو اس کے بارے میں وہ اس طرح سے نہیں لکھتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر پھر اس نے ہندوستان میں قیام کے دوران اپنا زیادہ تر وقت کلکتہ ہی میں کیوں گزارا؟ اور اس کا جواب یہ ہے کہ گراس کی ''نوع'' کے لکھنے والوں کو کلکتہ جیسا شہر پوری دنیا کی کسی بھی دوسری جگہ کی نسبت لکھنے کے لیے زیادہ بہتر مواد فراہم کرتا ہے۔ ''حقیقت کا بدن ظاہری پہناوے سے زیادہ حسین ہوتا ہے۔'' یہ بات اس نے حیدر آباد ڈور درشن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہی تھی۔ کلکتہ میں اس نے حقیقت کو ظاہری لبادے سے آزاد پایا تھا۔ ایک فنکار ہونے کی حیثیت سے وہ جس قدر ہو سکتا تھا

اس حقیقت کے قریب رہنا چاہتا تھا اور اس سے لطف اندوز ہو کر اس کا تجربہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شروع شروع میں وہ کلکتہ کے نواح میں آباد موجود باروئی پور کے علاقے میں ایک کرائے کے بنگلے میں رہتا تھا جہاں سے عام لوگوں کی طرح لوکل ٹرین کے ذریعے شہر (کلکتہ) آتا اور پھر اس کی گلیوں اور بازاروں میں مٹرگشت کرتا رہتا تھا۔

حالیہ چند ماہ اس نے ایک فنکار شیو پرسن کی بیوی کے والدین کے ہمراہ سالٹ لیک سٹی میں رہ کر گزارے تھے۔ اس بات کی گراس خاندان کو داد دیجئے کیونکہ وہ یہ سارا وقت پرتعیش ہوٹلوں یا پھر اپنے یورپی دوستوں کے ہمراہ نہایت آرام دہ ماحول میں بھی گزار سکتے تھے۔ ان تمام سہولیات کے باوجود دونوں میاں بیوی نے بھدر لوک کلکتہ والوں کی طرح کلکتہ میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ انہیں تکلیف اٹھانے میں لطف ملتا تھا بلکہ یہ سب صرف اس لیے تھا کیونکہ گراس کے خیال میں زندگی کی حقیقت کو قریب سے دیکھنے کے فن کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے یہ سب کرنا ضروری تھا تاکہ جو کچھ بھی وہ اس کے متعلق لکھے اس میں مستند ہونے کی سند موجود ہو۔ یہ بات سچ نہیں ہے کہ گراس کے لیے گندی وتاریک گلیاں بڑی دلکشی کا باعث تھیں یا دوسرے لوگوں کی خستہ حالی اسے نسلی برتری کا احساس دلاتی تھی۔ اس کی شخصیت کے اس پہلو سے متعلق مجھے کلکتہ کے میکس طرھون کے ڈاکٹر نجل نے آگاہ کیا تھا: ''اسے جہاں کہیں بھی بلایا گیا وہ وہاں گیا۔ ایک دن بستیوں میں گزارنے کے بعد وہ امیر صنعتکاروں کے گھر گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو فنکاروں اور ادیبوں کے درمیان زیادہ پرسکون محسوس کرتا تھا۔ کسی اور کی نسبت شیو پرسن نے اسے زیادہ قریب سے دیکھا تھا'' تمام تجربات گنٹر گراس اپنے استعمال میں لایا تھا۔

ٹی وی پر نشر ہونے والے ایک انٹرویو کے دوران اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا اور اس پروگرام میں گراس سے انٹرویو کرنے والی شخصیت عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر سکویرا تھے۔ پروگرام کا نہایت موزوں نام ''مایوسی پر گہری نگاہ'' رکھا گیا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا: ''جب امید کی کوئی وجہ نہ ہو تو ایسے میں امید کرنا ایک جرم ہے۔''

جس قدر آپ کلکتہ میں مایوسی سے آمنا سامنا کر سکتے ہیں اس لحاظ سے آپ دنیا

کے کس شہر میں اس کا سامنا کر سکتے ہیں؟

گنٹر گراس اس وقت یقینی طور پر کلکتہ کے متعلق اپنے ناول اور نظموں کو ترتیب دینے میں مصروف عمل ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ کلکتہ کو نہ تو پیئری کے (City of joy) کی صورت میں پیش کرے گا اور نہ ہی راجیو کے (Dying city) کی شکل میں سامنے لائے گا۔ وہ کلکتہ کو 'ابھی تک متحرک' ابھی تک دلکش' گردانتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ منظر عام پر آنے والا ناول ایک ایسے وسیع وعریض کوڑے کے ڈھیر کی نہایت ہنر مندی سے بنائی گئی تصویر ہوگی کہ جس پر انسانی کیڑوں کی بڑھتی ہوئی بھیڑ حرکت کرتی نظر آئے گی۔

مارٹن: فرانس کا لکھنوی باشندہ

اٹھارہویں صدی کے مسحور کن کرداروں میں سے ایک کردار فرانسیسی نژاد لکھنوی نواب کلاوڈ مارٹن (Claude Martin) (1800ء-1735ء) تھا۔ 17 سال کی عمر میں اسے فرانس سے پاؤنڈ چری بھجوا دیا گیا۔ جب پاؤنڈ چری برطانیہ کے قبضے میں آیا (1761ء) تو اس نے جان کمپنی کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی اور کبھی بھی اپنی فرانسیسی شہریت کو ترک کیے بغیر برطانوی افواج میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی حاصل کی۔

اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نے لکھنؤ میں بسر کیا جہاں اس نے دولت کے انبار اکٹھے کیے اور بہت سی محل نما رہائش گاہیں تعمیر کیں جو سب روبہ زوال فرانسیسی دمورش طرز تعمیر کا ملغوبہ تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے گورنر جنرلوں' مغلوں کے شاہی خاندان اور اودھ کے نوابوں کے لیے شاہانہ طرز کی تفریحات کا بندوبست کرتے ہوئے شاہانہ انداز سے زندگی بسر کی تھی۔ اس نے یورپی اور ہندوستانی داشتاؤں پر مشتمل ایک حرم بھی قائم کر رکھا تھا اور ان داشتاؤں کے بطن سے پیدا ہونے والے کئی بچوں کا وہ باپ بھی تھا۔ مارٹن کو جو بات دوسرے مالدار یورپی فوجیوں سے ممتاز کرتی تھی وہ اس کا جائز طریقوں سے دولت کمانا تھا۔ ان جائز طریقوں میں جائیداد کی خرید و فروخت' نیل کے پودوں کی تجارت' سود پر روپے کا بیوپار اور فرانسیسی پرفیوم اور مختلف نوع کے فن پاروں کی عیاش قسم

کے زمینداروں کو فروخت وغیرہ شامل تھی۔ اور شائد وہ اپنے یورپی مہماتی قبیلے کا واحد فرد تھا جس نے اپنی ساری دولت خیرات کر دی تھی۔ لکھنوٗ' کلکتہ اور لائن (فرانس) کے مقام پر قائم کیے جانے والے لا مارٹینیئر سکولوں کا جال اس ہی کا مرہون منت تھا۔ لکھنوٗ میں آج بھی اس کے مقبرے پر گھی کے چراغ روشن کیے جاتے ہیں اور غریبوں میں روپے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس نے ہندوستان کو ''میرا دوسرا گھر'' کہا ہے۔

مارٹن ایک پیدائشی کیتھولک تھا۔ ہندوستان میں بسر کیے جانے والے ماہ وسال نے اسے سیکولر بنا دیا تھا۔ اس کی وصیت پر عملدر آمد کروانے والوں نے ہندوستان میں لا مارٹینیئر سکولوں میں داخلے کو صرف غریب یورپی اور یورپی نژاد ایشیائی طبقے کے بچوں کے لیے محدود کر کے اس کی جائیداد کا غلط استعمال کیا تھا جبکہ عام ہندوستانی بچوں کے لیے ان اداروں میں داخلے کا حصول 1935ء کے بعد ہی ممکن ہو سکا تھا۔

ہیلنا بلاواتسکی : وشواس ٹھگنی

باہر سے آنے والوں کی جانب سے ہم میں لی جانے والی دلچسپی پر ہم ہندوستانی اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ ان کی تصدیق (آیا وہ وہی ہیں جو دکھائی دیتے ہیں) بھی نہیں کرتے ہیں تاوقتیکہ ہمیں ان کی الماریوں میں ایسے انسانی ڈھانچے سجے ہوئے دکھائی نہ دیں جو ان کی بے رحمی کا نشانہ بن چکے ہوتے ہیں۔ چند ماہ قبل میں نے روز میری کی تحریر کردہ اینی بیسنٹ کی سوانح عمری پر اپنا تبصرہ کرتے ہوئے ایسی ہی چند شخصیات کو بے نقاب کیا تھا۔ خود ہماری اینی صاحبہ مدراس میں ایک نجات دہندہ کی حیثیت سے ابھرنے اور ہندوستانی نیشنل کانگریس کی صدر منتخب ہونے سے پہلے معقول تعداد میں ناجائز تعلقات رکھتی تھی اور برنارڈ شاء سمیت عاشقوں کے ایک محدود حلقے کی بھی مالک تھیں۔ یہ بات میں نے اب دریافت کی ہے کہ اسے فلسفیانہ مذہب کی طرف راغب کرنے والی اور اس کی گرو مادام ''بلاواتسکی'' بھی کچھ کم رنگین شخصیت نہیں تھی۔ یہی حال ان کے ساتھیوں کرنل اولکٹ سی۔ ڈبلیو۔ لیڈ بیٹر اور کانگریس کے نام نہاد بانی ایلن اوکٹیون ہیوم وغیرہ کا تھا۔

میں اس پردہ داری کو ''بلاواتسکی'' سے منسوب کرتا ہوں۔

وہ 1831ء میں ہیلنا ہان کے نام سے پیدا ہوئی۔ اس کے باپ کا تعلق اشرافیہ سے تھا جو زار کی فوج میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کا کزن نواب سرگئی وٹی وزیراعظم کے عہدے تک پہنچا۔ وہ راسپوتین کا دوست تھا۔ 16 سال کی عمر میں ہیلنا کی شادی ایک

چالیس سالہ مرد سے کردی گئی تھی۔ اپنی شادی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے ہی ہیلنا نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ کسی حد تک وہ ایک جنگلی گھوڑی تھی اور اس نے تقریباً ہر طرح کے پیشے میں طبع آزمائی کی تھی۔ سرکس میں گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری' پیانو بجانے کے اسباق اور مُردوں کی روحوں کو بلانے کے لیے معمول بننا ان پیشوں میں شامل تھا۔ وہ ایک ایسی بے چین مسافر تھی جس نے یورپ کے بیشتر علاقوں' امریکہ' کینیڈا' مصر' ہندوستان اور تبت کا سفر کیا ہوا تھا۔ سرگرم زندگی گزارنے کے باوجود اس کا وزن بڑھتا چلا گیا یعنی جب وہ تیس سال کی عمر کو پہنچی تو اس کا وزن تقریباً 116 کلو تھا۔ سرکس میں پیش کیے جانے والے اپنے مظاہروں میں سے ایک کے دوران وہ گھوڑے سے گری تھی اور اپنی بیضہ دانی کو اصل جگہ سے ہلا بیٹھی تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی اس نے سیکس کرنے کی خواہش کو اسے ''ناپاک'' قرار دے کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''میں خود میں کسی چیز کی کمی محسوس کرتی ہوں اور جگہ (بیضہ دانی) کھیرے کے گودے سے بھری ہوئی محسوس ہوتی ہے۔'' یہ بات اس نے اپنی ایک سہیلی کو خط میں لکھی تھی۔ اپنے اشرافیہ کے شجرۂ نسب کے باوجود اس نے گھٹیا ترین زبان کا استعمال سیکھ رکھا تھا۔ جی۔ کے چیسٹرٹن نے اس کے بارے میں کہا تھا: ''ایک گھٹیا' ظرافت بھری' زوردار اور رسوا کن بوڑھی بدمعاش۔'' کولن ولسن قدرے نرم لہجہ اختیار کر لیتا ہے جب وہ اس کی زبان کو ''رنگین اور تخیلاتی گالیاں'' کہتا ہے۔ وہ چین سموکر بن گئی تھی اور اکثر حشیش کے سوٹے لگانے لگی تھی۔

طلاق لیے بغیر ہیلنا نے مائیکل بیٹلے نامی شخص سے دوسری شادی کر لی تھی۔ بیٹلے عمر میں اس سے سات سال چھوٹا تھا اور اس نے ہیلنا کے بستر میں کبھی نہ گھسنے کا عہد بھی کیا تھا۔ جب اس نے عہد شکنی کی تو اسے ہیلنا نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ ''جنسی محبت ایک وحشیانہ اشتہا ہے جسے فرمانبرداری سے فاقے دیئے جانے چاہئیں۔'' بلاواتسکی نے لکھا تھا تاہم یہ قول اسے دل لگیاں کرنے سے بچا نہیں پایا تھا۔ امریکہ میں اس کی ملاقات ایک سفید داڑھی والے وکیل کرنل ہنری سٹیل اولکٹ سے ہوئی جو فوج میں اعزازی عہدے کا مالک اور شادی شدہ تھا۔ یہ تو ہمارے علم میں نہیں ہے کہ ان دونوں کا آپس میں جسمانی تعلق تھا یا نہیں لیکن یہ ضرور ہوا تھا کہ کرنل نے بلاواتسکی کے ساتھ مل کر

گھر بنانے کی خاطر اپنی پہلی بیوی کو تین بچوں سمیت چھوڑ دیا تھا۔

کرنل اولکٹ اور ہیلنا پیٹرونا بلاواتسکی (جسے بعد میں اس کے پیروکاروں نے H.P.B کے مخفف سے یاد کیا) میں کافی اقدار مشترک تھیں یعنی جادو میں دلچسپی' مرے ہوئے لوگوں کی روحوں کو بلانا اور مخفی مسلکی رسوم کا مطالعہ وغیرہ۔ دونوں نے مل کر ایک ''حیرت آفریں کلب'' بنایا۔ کلب کے اراکین نے فرنیچر کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا' میزوں کو بجائے جانے کی آوازیں سنیں اور مصر اور تبت میں اڑتے ہوئے ''آقاؤں'' سے پیغامات وصول کیے جو نہایت پراسرار انداز میں چھت سے نیچے گرتے تھے۔ ستمبر 1857ء میں دونوں نے مل کر فلسفیانہ مذہب کی انجمن قائم کی تھی۔

ہیلنا پیٹرونا بلاواتسکی (H.P.B) نے اپنے مشاہدات اپنی مشہور کتاب ''Unveiled Isis'' میں بیان کیے تھے جو 1877ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ''بنیادی انواع'' کے متعلق لکھا گیا تھا جن کا آغاز قطب جنوبی سے ہوا تھا۔ اور جب وہ دونوں جسمانی ملاپ ایجاد کرنے کے لیے ایشیا پہنچے تو اس وقت کتاب تیزی سے کامیابی کے زینے طے کر رہی تھی۔

کرنل اور ایچ پی۔ بی نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان ہی ان کے لیے موزوں ملک تھا اور شاید یہ بھی کہ وہ آریہ سماج کے ساتھ اتحاد کر سکتے تھے۔ سوامی دیانند نے ان کی ابتدائی تجاویز مسترد کر دیں۔ اس نامنظوری نے ان کے دوسرے ہندوستانی مداحوں کو بھگایا نہیں تھا۔ ایچ۔ پی۔ بی نے اپنے روحوں سے باتیں کرنے والے حلقے میں لوگوں کا جم غفیر اکٹھا کر لیا اور پھر سب نے دیکھا کہ وزنی چیزیں ہوا میں تیرنے لگیں اور کوٹ ہومی لال سنگھ نامی ایک روح کی جانب سے پیغامات موصول ہونے لگے وہ لوگ جنہوں نے کوٹ ہومی سے تبادلہ خیالات کرنے کی سعادت حاصل کی ان میں ایلن اوکٹیوین ہیوم بھی شامل تھا۔ ہندوستانی ایچ۔ پی۔ بی کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ یہی اینی بسنٹ کے ساتھ ہوا تھا۔ لندن میں ہونے والی ان دونوں کی ابتدائی ملاقات نہایت ڈرامائی تھی۔ اینی ایچ۔ پی۔ بی کی لکھی ہوئی کتاب ''The Secret Doctrine'' سے شدید متاثر ہوئی تھی جو اس نے نظر ثانی کے لیے بھجوائی تھی۔ اینی اسے ملنے کے لیے گئی۔

اس ملاقات کو وہ ان الفاظ میں قلمبند کرتی ہے: ''میں اس کی خدمت میں حاضر ہوئی' جھکی اور اس کا بوسہ لیا۔ میں اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پوچھا:'' کیا آپ مجھے اپنی شاگردی میں لیں گی اور مجھے اس دنیا کے سامنے آپ کو اپنا استاد کہلوانے کا شرف بخشیں گی۔''

ایچ۔پی۔بی کی ایک ارواح پرست اور ایک گرو کی حیثیت سے بنی ہوئی ساکھ ایک افسوسناک اختتام کو پہنچی۔ بمبئی میں اس کی گھریلو خادمہ ایما کولمب نے سوسائٹی آف فزیکل ریسرچ کے ایک تفتیشی افسر کے سامنے انکشاف کیا تھا کہ ایچ۔پی۔بی کوٹ ہومی کے پیغامات خود لکھتی تھی اور انہیں چھتوں اور دیواروں کی درزوں میں سے نیچے گرایا جاتا تھا۔ اسی دوران ایک امریکی مصنف نے اخبارات کو لکھا تھا کہ کوٹ ہومی کے پیغامات میں لکھے گئے کئی حصے اس کی کتاب میں سے نقل کیے گئے تھے۔

جب بمبئی میں یہ انکشافات کیے جا رہے تھے تو اس وقت ایچ۔پی۔بی لندن میں تھی۔ وہ فوراً ہندوستان واپس پہنچی اور اس نے ایما کولمب اور عیسائی مشنریوں سے انتقام لینے کی قسمیں کھائیں کیونکہ ہیلینا کے نزدیک اسے بدنام کرنے کی اس سازش کے پیچھے ان سب کا ساتھ تھا لیکن مشنریوں نے ایما کو اپنے ساتھ ملا کر ایک سابقہ جنرل کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کر کے (جس نے ایما کو چور اور جھوٹا کہا تھا) سبقت حاصل کر لی تھی۔ یہ بات ایچ۔پی۔بی کو گواہوں کے کٹہرے میں لا کر کھڑا کر سکتی تھی۔ یہ بھانپ کر دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہیلینا ہندوستان سے پرواز کر گئی تھی۔ اس نے 8 مئی 1891ء کو 60 سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کا سوانح نگار جان سائمنڈا سے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتا ہے: ''زندہ رہنے والی شاندار خواتین میں سے اس نے ایک زندگی میں ہزار زندگیاں جی لیا تھا۔''

آج ہم اس جیسی وشواس ٹھگنی کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟

❖ ○ ❖

جرنیل سنگھ کا بھوت

آج کل میری ذہنی مصروفیت سکھوں اور پنجاب کی آخری پندرہ سالہ تاریخ کو قلمبند کرنا ہے۔ ایک بات جو میری سمجھ سے بالاتر ہے وہ جرنیل سنگھ بھنڈراں والی کی شخصیت ہے۔ جب وہ پنجاب کے منظر پر پہلی دفعہ نمودار ہوا تو میں نے اسے ان سینکڑوں دیہاتی سنتوں میں سے ایک سمجھ کر مسترد کر دیا تھا جو دیہاتوں میں ایک کوڑی کے بدلے بارہ کی تعداد میں عام دستیاب ہوتے ہیں۔ پھر جب اس نے خود کو گولڈن ٹیمپل میں چھپا لیا اور ہندو مخالف پر جوش ملامتی تقریر داغی تو اس وقت میں نے اُسے ''پاگل نفرت فروش'' کہا تھا۔

جب وہ آپریشن بلیو سٹار میں مارا گیا تو میں نے باقاعدہ تسلیم کیا کہ وہ ایک جنگجو کی طرح اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سوچ کر سکھ کا سانس بھی لیا کہ اس کا قصہ تمام ہوا۔ لیکن حقیقت میں ایسا ہوا نہیں۔ گولڈن ٹیمپل میں موجود اس کا قد آدم پورٹریٹ لوگوں کی اچھی خاصی تعداد کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ سکھوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے وہ ''امر شہید'' بن چکا ہے۔ اس کی تصاویر اور اس کی تقاریر کی کیسٹس ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ اس کے نام ''سنت بابا جرنیل سنگھ بھنڈراں والے'' کا احترام کیا جانا آج بھی جاری وساری ہے۔ اس کا بھوت پنجاب کے دیہاتوں میں بار بار چکر لگاتا ہے اور وہاں رہنے والے پنجابی ہندوؤں کی نیند اڑا رہا اور پڑھے لکھے سکھوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہا ہے۔

ایسا کیوں ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی معقول باتیں اس کی انتہائی قابل نفرت باتوں کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہیں' اتنی مقبولیت حاصل کر چکا تھا؟ اس ضمن میں اکثر و بیشتر پیش کی جانے والی اس وضاحت کو میں بالکل رد کرتا ہوں کہ بھنڈراں والا کانگریس کے تھنک ٹینک یعنی مسز گاندھی' ذیل سنگھ اور سنجے گاندھی کی پیداوار تھا۔ مسز گاندھی اور سنجے نے کبھی اس کی طرف دیکھا بھی نہ تھا جبکہ ذیل سنگھ نے صرف ایک بار اس سے بات کی تھی اور دوسری بار کچھ فاصلے سے نظر دوڑانے پر اکتفا کیا تھا۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کانگریس نے اس کی شہرت سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایسا تو اکالیوں نے بھی اس کے ساتھ کیا تھا۔ بھنڈراں والا نے دونوں جماعتوں کو بری طرح تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ سنت لونگووال نے ایک مرتبہ اسے کانگریس حکومت کی پٹائی کرنے کے لیے وساڈا ڈنڈا' کہا تھا پھر اسی ڈنڈے نے اکالیوں اور حکومت دونوں کی خوب گت بنائی تھی۔

ان تمام مظاہر کے بعد بالآخر میں بھنڈراں والا کی شخصیت کی بظاہر معقول وضاحت تک پہنچ چکا ہوں۔ ہماچل یونیورسٹی کے گوپال سنگھ کی جانب سے ''پنجاب ٹوڈے'' کے زیر عنوان مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے پریتم سنگھ کا ''سکھوں کی تحریک احیائے مذہب'' پر ایک مضمون شامل کیا گیا۔ یہ مضمون ان حالات کا پس منظر بیان کرتا ہے جس کی وجہ سے بھنڈراں والا وجود میں آیا تھا۔ آپ لوگ مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ سب اس خوشحالی کا کیا دھرا تھا جو سبز انقلاب کے ساتھ آئی تھی۔ خوشحالی کے ساتھ بگاڑ آیا' شراب' تمباکو نوشی' نشے کی عادت' جوا' بلیو فلمیں اور زنا کاری میں شدید اضافہ ہوا اور اس بگاڑ کا بدترین شکار وہ عورتیں' بچے' بیویاں اور کسانوں کی نسل ہوئی تھی جو اپنی اس خوشحالی کو پوری طرح ہضم نہیں کر پائے تھے۔ ان حالات میں بھنڈراں والا ان برائیوں کے خلاف پرچار کرنے آیا اور پھر اس نے ''امرت پرچار'' کی ایک زوردار تحریک چلائی۔

اس پرچار کے لیے وہ ہر جگہ گیا اور اس نے ہزاروں کی تعداد میں سکھوں کو پاک صاف کیا اور انہیں مذہبی اجتماعوں میں سرعام قسم کھانے پر مجبور کیا کہ وہ ممنوعہ چیزوں کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ پھر ان سکھوں نے اپنے کیے ہوئے عہد کو نبھایا تھا۔ پہلے

جو رقم فضولیات میں ضائع ہو جاتی تھی اسے بچا لیا گیا تھا۔ پہلے جو وقت شراب نوشی میں ضائع کر دیا جاتا تھا اب اسے زیادہ محنت اور لگن سے کاشتکاری میں خرچ کیا جانے لگا تھا۔

بھنڈراں والا نے کسان سکھوں کے ایک بڑے حلقے کو تباہی و بربادی سے بچا لیا تھا۔

یہ ان لوگوں کے بیوی بچے تھے جو اسے ایک نجات دہندہ اور ولی مانتے تھے یعنی وہ ایک اچھا انسان تھا۔ اسی تاثر کو قائم رکھنے کی خاطر بھنڈراں والا نے اپنے آپ پر ایک ایسے مضبوط پہلوان نما آدمی کا حاشیہ چڑھا لیا جو اپنی بالوں سے بھری چھاتی پر کارتوسوں کی پیٹی اور کمر کے گرد پستول باندھے ہاتھ میں مہاراجا رنجیت سنگھ کی طرح چاندی کا تیر اٹھائے پھرتا تھا۔ جب وہ اندرا گاندی کو "پنڈت دی دھی" اور مرکزی حکومت کو "بنیا ہندو سرکار" کہہ کر مخاطب کرتا تو لوگوں کے ہجوم اس سے اپنی والہانہ محبت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

بعد میں جب بھنڈراں والا گولڈن ٹیمپل میں منتقل ہو گیا اور ہندو کش تقاریر کرنے لگا اور اس کے غنڈے معصوم لوگوں کو قتل کرنے لگے تو اس کے مداحوں نے ان الزامات کو حکومتی پروپیگنڈا کہہ کر مسترد کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کے لیے وہ اب بھی ایک نیک آدمی تھا جس نے اپنی زندگی خالصہ پنتھ کے لیے وقف کر دی تھی۔ بھنڈراں والا کے بھوت کو پنجابیوں کے ذہن سے دھونی دے کر بھی آسانی سے نہیں نکالا جا سکے گا۔

بابا امتی کے ساتھ

ہمارا ملک اس معاملے میں خوش قسمت ہے کہ یہاں گاندھی جی کے ونو با بھوو (Vinoba-Bhave) طرز کے بہت سے لوگ موجود ہیں جو ہمارے آج کے دور میں پائے جانے والے نیتاؤں کے ہر روز بدلتے عقیدوں سے ہمیشہ بے داغ ہی رہے ہیں اور نہایت مستقل مزاجی سے اپنے منفرد نشانات پر چلتے آ رہے ہیں۔ اگر ہندوستان مایوسی کی اس دلدل سے دوبارہ ابھر آتا ہے جہاں اس کے سیاستدانوں نے اسے ٹھکانے لگا رکھا ہے تو اس کی ایک امید وہ مثال ہے جو ان لوگوں نے اب تک قائم کر رکھی ہے۔ کاش مجھے ان سب لوگوں کے بارے میں علم ہوتا اور میں ان شخصیات کے متعلق لکھ سکتا۔ تقریباً تین سال پہلے ان شخصیات میں سے ایک کرشنا بائی نمبکر سے پونا ائیر پورٹ پر میرا آمنا سامنا ہوا تھا۔ وہ خاتون اس وقت پنجاب کی صورتحال پر اس قدر برہم تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود کو گولڈن ٹیمپل کی سیڑھیوں پر قربان کر دینے کی فکر میں مبتلا ہو۔ اب چند ہفتے پہلے میں کلکتہ میں بابا امتی سے ملا تھا۔ یہاں ہمارے سامنے ایک نہایت بیمار اور مرتا ہوا آدمی ہے جو بمشکل چند منٹوں کے لیے بیٹھ یا کھڑا ہو سکتا ہے لیکن ابھی بھی وہ ملک کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے اپنے منتخب سائیکل سواروں کے گروپ کے ساتھ پورے ملک کا چکر لگاتا ہے۔ آیا وہ ملک کو ایک ہی لڑی میں پرونے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکے گا' یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اس نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔ اس کی

اس کوشش کے جواب میں ہمیں سرِتسلیم خم کرنا چاہیے۔ جس مٹی پر اس کے پاؤں پڑے ہیں اس مقدس مٹی کو حاصل کر کے اپنے ماتھوں پر تلک لگا لینا چاہیے۔

کلکتہ میں امتی بابا نے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر رکھا تھا۔ ان میں کروڑ پتی ایس کے برلا اور اس کی بیوی سرلا' مسلمانوں کے حقوق کو برقرار رکھنے والا شعلہ فشاں سید شہاب الدین' اداکار وکٹر بینر جی' پیلے چولے میں ملبوس گاندھین سوامی اگنیویش اور انتظامی امور کا ماہر اد۔ پی۔ شاہ بھی شامل تھے۔ ملکی یگانگت پر ہم سب نے تقریباً ایک ہی بات کہی کیونکہ اس موضوع پر اب کہنے کے لیے کسی کے پاس بھی کوئی نئی بات تو تھی نہیں۔ کہنے والے بے شمار ہیں اور کرنے والے صرف چند ایک' یہ ہندوستان آپ سب کے لیے ہے۔

ہیموتی نندن بہوگن

میرا خیال تھا کہ بہوگن ایک دن ہندوستان کا وزیر اعظم بنے گا۔ اس عہدے پر فائز ہونے کے لیے اس کا تعلق نہایت موزوں ریاست سے تھا۔ اس کی شخصیت فرقہ وارانہ تعصب سے پاک اور نظریات میں ''بائیں طرف'' جھکاؤ رکھتی تھی۔ فصیح' ہر طرح سے باخبر اور اپنے خیالات کے اظہار میں صاف گوئی کی خوبیاں اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے ہندی اور کسی حد تک امریکی لب و لہجے کی حامل انگریزی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا اور اس کا نام تو خیر کانوں کو بھلا لگتا ہی تھا: ''ہیموتی نندن۔'' اب آپ خود ہی سوچئے کہ ایسا ہندوستانی جو نہ تو کوئی نہرو تھا اور نہ ہی گاندھی لیکن پھر بھی اسے بھارت ورش کا پردھان منتری بننے کا خواب دیکھنے کے لیے اور کس چیز کی ضرورت تھی؟ جب میری بہوگن سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو میں نے اسے کہا تھا کہ جس ٹال کی لکڑی سے وزیر اعظم بنائے جاتے ہیں وہ بھی اس ٹال کی لکڑی تھا۔ اس نے میری اس بات سے اتفاق کیا تھا لیکن اس بارے میں وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کب وزیر اعظم بنے گا۔ وہ ایک بلند نظر انسان تھا اور ساتھ ہی ساتھ بے صبرا بھی۔ بلند نظری اور بے صبری کا ایک جگہ یکجا ہونا بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ دونوں مل کر بلند فشار خون اور دل کی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ میری بھوگنہ سے بارہا ملاقات رہی ہے۔ وہ کسی بھی طرح کے رکھ رکھاؤ سے بالکل عاری شخص تھا اور دن میں کسی بھی وقت گھنٹی بجا کر چائے پینے کے لیے

ٹک سکتا تھا۔ اس میں نہایت شاندار گفتگو کرنے کی خوبی موجود تھی اور وہ بغیر رکے گھنٹہ بھر یا اس سے بھی زائد وقت تک دلچسپ اور پرزور مباحثہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اکثر وہ بیشتر اس کے خطاب کا خاتمہ میری بیوی کے اس اعلان پر ہوا کرتا تھا کہ بھئی بس کرو، ہم اگلی طے شدہ ملاقات کے لیے لیٹ ہو رہے ہیں۔ اپنی طبقاتی دھونس سے مکمل طور پر عاری ہونے کی بنا پر وہ نہایت مسحور کن شخصیت ثابت ہو سکتا تھا۔ میرے ملازموں کو وہ اس طرح پہچانتا تھا جیسے وہ اس ہی کے علاقے کے لوگ تھے۔ میرے ملازموں کے ساتھ ہمیشہ ان ہی کے انداز میں بات چیت کرتا اور اپنے مسلسل لگائے جانے والے اوپر تلے چکروں کے دوران ہمیشہ انہیں ان کے نام لے کر پکارتا تھا: ''چندن بھائی' گرما گرم چائے پلاؤ۔'' سب ملازم اس کو چاہتے تھے۔

آخری مرتبہ وہ میرا ایک مضمون پڑھنے کے فوراً بعد آن پہنچا تھا۔ میں نے اس مضمون میں بھوگن کی وی۔ پی۔ سنگھ اور اپوزیشن کو مایوس کرنے پر ذرا کھنچائی کی تھی۔ ''اگر تم جیسے دوست مجھ پر تنقید کرنے لگے ہیں'' اس نے فون پر کہا: ''تو میں جانتا ہوں ضرور کوئی بات ہے' میں اپنی طرف سے وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔'' اور پھر اس نے وضاحت بھی کی۔

وہ الٰہ آباد میں وی۔ پی سنگھ کے بطور مخالف امیدوار کھڑے ہونے پر برہم تھا۔ ''یہ ہمیشہ سے میرا حلقہ تھا انہیں کم از کم مجھ سے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔'' اس نے کہا' اسے وی پی سنگھ کا اپوزیشن کا وزیر اعظم بن کے ابھرنا پسند نہیں آیا تھا۔ ''مجھے فالتو اور غیر اہم سمجھا گیا ہے جیسے میں قومی سیاست میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہوں۔ مجھے اپنی عزت نفس کو دوبارہ سے استوار کرنا ہے۔ میں انہیں یہ کر کے دکھاؤں گا۔'' آہ! افسوس کہ بھوگن اس منزل کو نہیں پا سکا جو اس کے نزدیک اس کا مقدر تھی کیونکہ دیوتاؤں نے اسے ہرا دیا تھا۔

❖ O ❖

کانپور کی چاٹ

''میں ایک بار وہاں گیا تھا۔'' میرے دوست سولی سوراب جی نے کہا: ''اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کبھی بھی وہاں دوبارہ جانا پسند نہیں کروں گا۔'' میرے دوست کے کہے ہوئے یہ الفاظ میرے ان تاثرات کا بخوبی احاطہ کرتے ہیں جو میں اتر پردیش کے سب سے بڑے شہر کے متعلق رکھتا ہوں۔ یہ فیصلہ کانپوریوں کے خلاف نہیں ہے۔ وہ بیچارے تو اتنے ہی بھلے' مہمان نواز اور ملنسار ہیں جتنے آپ کو ملک کے کسی بھی دوسرے حصے میں پائے جانے والے ایسے لوگ مل جاتے ہیں۔ درحقیقت یہ فیصلہ کانپور میں کسی بھی قسم کی کو یکجا سے کی چیز نہ ہونے پر سنایا گیا ہے مثلاً نہ کوئی تاریخی عمارت اور نہ کوئی چوراہے' نہ بلند و بالا شاپنگ سنٹرز' نہ خوبصورت پارک نہ جھیلیں' نہ فائیو سٹار ہوٹل اور نہ ہی کسی قسم کی ٹیکسیاں اور حد تو یہ ہے کہ گنگا کنارے کوئی پرکشش تفریحی گھاٹ تک نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ شہر تو بس بے ترتیب بازاروں اور رہائشی علاقوں کا بے ڈھنگا سا انبار ہے جہاں صرف چند ایسے گول چکر پائے جاتے ہیں جن کے وسط میں دائمی طور پر مونچھوں کو بل دینے والے انقلابی چندر شیکھر کے انتہائی غلیظ مجسمے ایستادہ ہیں۔ اس شہر کو باقاعدہ ایک خوبصورت شہر کی شکل دی جا سکتی ہے کیونکہ یہاں امیر لوگوں کی اچھی خاصی تعداد بستی ہے لیکن ان کی تمام صنعتوں نے اس شہر کو ماسوائے ایسے گندے نالوں کے جو گنگا کو آلودہ کرتے ہیں اور کچھ نہیں دیا ہے۔

''مجھے کان پور میں کیا دیکھنا چاہیے؟'' میں نے ہرجیت سے پوچھا جس کی بہن اور بہنوئی (آہلوو الیاں) کے ہاں مجھے ٹھہرنا تھا۔ مسائل پر کافی حد تک سوچ بچار کرنے کے بعد وہ بولی: ''تمہیں جے اینڈ کے مندر ضرور دیکھنا چاہیے جو سارے کا سارا ماربل سے بنا ہے اور برلا مندر کی نسبت زیادہ بڑا اور خوبصورت ہے۔ اور 'بھوڑ' بھی جو کانپور سے صرف آدھ گھنٹے کی مسافت پر ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں 'لاؤ' اور 'کش' پلے بڑھے تھے اور دھرتی ماں نے سیتا کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا یہاں تمہیں دریا کا بہت خوبصورت نظارہ بھی دیکھنے کو ملے گا۔'' یوں لگتا تھا کہ اب اس کے پاس مزید ایسی جگہوں کی فہرست اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی جنہیں کانپور میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ''اور ہاں'' وہ خوشی سے یوں چلائی جیسے کوئی انتہائی اہم بات اس کے ذہن میں آئی تھی: ''تم چاٹ ضرور کھانا' its too good'' جب کسی بھی چیز کو ہرجیت بہت بڑھا چڑھا کر بتانا چاہتی ہو تو اس کے لیے ''Too good'' اس کا پسندیدہ ترین تعریفی جملہ ہے لہٰذا اب میری فہرست میں تین چیزیں شامل تھیں یعنی سنگھانیا مندر' بھوڑ اور چٹ پٹی چاٹ سے لبریز بڑ کے پتے۔

''کان پور'' نے یہ نام کہاں سے لیا تھا۔ برطانوی ''Cawnpore' کی وجہ سے میں یہ سمجھا کہ شاید یہ نام خانپور سے بگڑ کر بنا ہے جو شاید کسی خان کے نام پر رکھا گیا ہو۔ اینگلو انڈین زبان کی لغت ''ہابس اینڈ جانسن'' میں درج ہے کہ کان پور کا یہ نام ''کرشن' کی وجہ سے ہے۔ ہمارے دوسرے بہت سے بڑے شہروں کی طرح کانپور کا ایک بڑا حصہ بھی برطانویوں کی بدولت معرض وجود میں آیا ہے۔ 1766ء میں پہلی مرتبہ اودھ کے نواب نے یہاں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو چھاؤنی قائم کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس شہر کی بیشتر عمارتیں وکٹورین طرز تعمیر کی حامل ہیں جبکہ کچھ مشہور جگہیں انگریزی طرز تعمیر کی ہندوستانی شکل میں موجود ہیں۔ کان پور کی ہیرا منڈی کو ''مول گنج'' کہا جاتا ہے۔ اس جگہ کو ایک برطانوی افسر مول نے خاص طور پر سپاہیوں کے لیے چکلے کے طور پر قائم کیا تھا۔

بھوڑ جا کر بھی شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ میرا نہیں خیال کہ تاریخی علامات سے ایسی کوئی بات ثابت ہوتی ہے کہ والمیکی کا آشرم یہاں پایا جاتا تھا یا پھر اس انوکھے سے کمرے کا کوئی وجود تھا جسے ''سیتا جی کی رسوئی'' کہا جاتا ہے۔ تاہم' وہاں پر ٹھہرنے کی

غرض سے قائم کیا گیا ایک مینار بھی موجود ہے جہاں سے آپ گنگا کا پرشکوہ نظارہ کر سکتے ہیں۔ جو بات بھوڑ کو ایک تاریخی زیارت گاہ بنا سکتی ہے وہ ڈھونڈو پت کا قلعہ ہے۔ ایک دیو قامت دروازے کے ساتھ پڑے ہوئے پتھروں کے ڈھیر کے علاوہ اس کی بہت کم باقیات بچی ہیں۔ قریب ہی واقع ایک پارک کے وسط میں جو خود رو جھاڑیوں سے اٹا پڑا ہے مراٹھہ سردار کا سنگ مرمر سے بنا مجسمہ ایستادہ ہے جو اس وسیع اراضی کی یاد دلا رہا ہے جہاں کبھی پیشواؤں کی حکمرانی تھی۔

سنگ مرمر کا بنا ہوا ''سنگھانیا مندر'' کانپور کا فخر ہے۔ یہ واقعی صحیح معنوں میں طرز تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اسے شہر کے مرکز کی بجائے ایک اونچے برج پر گنگا کنارے موجود ہونا چاہیے جہاں اس مندر کی سیڑھیاں اترتی ہوئی دریا تک پہنچتی ہوں۔

جس بات پر کان پور حقیقی معنوں میں فخر کر سکتا ہے وہ اس کی IT (انفارمیشن ٹیکنالوجی) ہے۔ اس شہر کو کمپیوٹر ریسرچ میں پورے ملک پر سبقت حاصل ہے۔ دوسرے IT شعبوں کی طرح یہاں بھی ذہین ترین طالب علم پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے کیمپس میں ان کا اپنا ایئر کرافٹ اور رن وے کی پٹی موجود ہے۔ خوش قسمتی سے یہ کیمپس کانپور کے بازاروں میں موجود بے سرے پن سے کافی دور الگ تھلگ مقام پر واقع ہے۔

کان پور کی مشہور چاٹ کسی طور بھی وبال جان سے کم نہ تھی۔ میں اس سے زیادہ تیکھی اور چٹ پٹی چاٹ کا مزہ دلی ہی میں اڑا چکا تھا۔ لیکن میرے خیال میں بمبئی کی بھیل پوری ذائقے میں سب پر سبقت لے گئی تھی۔ کان پور کی جوشاندہ نما چاٹ حد درجہ ثقیل اور جلدی ہضم ہونے والی نہ تھی۔ اس چاٹ کی بدولت میرے پیٹ میں ایسی کھلبلی مچی کہ کان پور سے واپس آنے کے دو دن بعد تک بھی مجھے اس شہر کی یاد دلاتی رہی تھی۔

❖ ○ ❖

ڈاکٹر رادھا کرشنن

اگر آج ڈاکٹر رادھا کرشنن زندہ ہوتے تو اگلے ہفتے اپنی سوویں سالگرہ منا رہے ہوتے رادھا کرشنن ہر لحاظ سے ایک ایسی باکمال عالم و فاضل شخصیت تھے جس کی ذہانت اپنے حاصل مطالعہ کو ترتیب وار قلمبند کرنے اور کچھ نہ کچھ نیا تخلیق کرنے میں پوشیدہ تھی۔ ان کے ناقدین کا دعویٰ تھا کہ وہ کوئی حقیقی مفکر نہیں تھے بلکہ فقط ہندوازم کی ایسی زبان میں ترجمانی کرنے والے تھے جو مغرب والوں کی سمجھ میں آ سکے۔ علمی حاسدوں کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی جس نے ان کے نمایاں کارناموں کے قد کو گھٹانے کی کوشش کی تھی۔ ایسے سب حاسد گمنامی کی دھول کا شکار ہو چکے ہیں جبکہ رادھا کرشنن کی کتابیں آج بھی پوری دنیا میں پڑھی جا رہی ہیں اور ان کی آواز آج بھی ان خوش قسمت کانوں میں گونجتی ہے جنہوں نے کبھی ان کی ساحرانہ خطابت کا لطف حاصل کیا تھا۔

رادھا کرشنن 5 ستمبر 1888ء کو آندھرا کے ایک گاؤں تیروتنی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد تحصیلدار کے دفتر میں کلرک تھے اور رادھا کرشنن ان کی دوسری اولاد تھے۔ ایسا مدراس کرسچین کالج میں پہنچنے کے بعد ہوا کہ انہوں نے ایک ایسے طالب علم کی حیثیت سے دوسرے لوگوں کی توجہ حاصل کر لی جو یادداشت اور الفاظ کی دولت سے بطور خاص نوازا گیا تھا۔ ابھی ان کی عمر بمشکل 20 سال تھی جب انہوں نے اپنے ایم اے کے تھیسس کے ایک حصے کے طور پر "Ethic of Vedanta" لکھی تھی۔ کالج کے

زمانے میں انہوں نے اپنی گزر بسر ٹیوشن پڑھا کر کی اور ان کی پہلی نوکری بحیثیت ایک استاد کے 60 روپے ماہوار سے زیادہ کی نہ تھی۔

وہ کبھی کسی قاعدے قانون پر پورا نہیں اترتے تھے۔ ہمیشہ اپنی کلاس لینے کے لیے 20 منٹ پہلے ہی کلاس سے نکل جاتے تھے ان کا کہنا تھا کہ وہ تمام کام 20 منٹ میں نپٹا لیتے تھے۔ ان کے طلبا ان سے بہت خوش تھے۔

اگرچہ انہیں تحریک آزادی سے کافی ہمدردانہ لگاؤ تھا لیکن رادھا کرشنن مہاتما گاندھی سے اپنی پہلی ملاقات (1918ء) پر کچھ اتنے زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ''گاندھی جی نے مجھ سے کہا کہ دودھ مت پیو کیونکہ یہ بڑے گوشت کا عرق ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ اس طرح ہم سب وحشی ہوئے کیونکہ ہم سب اپنی ماؤں کا دودھ پیتے ہیں جو کہ انسانی گوشت کا عرق ہے۔''

گاندھی کے مقابلے میں رابندر ناتھ ٹیگور نے انہیں زیادہ متاثر کیا تھا۔ انہوں نے اس شاعر کے فلسفے پر کتاب بھی لکھی تھی اور اس کتاب کے لکھے جانے پر ٹیگور نے باقاعدہ اعتراف بھی کیا تھا کہ ''یہ اس کی توقعات سے بڑھ کر ہے۔'' اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا باقاعدہ آغاز رادھا کرشنن نے میسور یونیورسٹی سے کیا تھا۔ وہاں سے وہ کلکتہ یونیورسٹی میں پہلے کنگ جارج پنجم پروفیسر بننے کے لیے چلے گئے تھے۔ اپنے کیرئیر کے دوران انہیں اس وقت شدید دھچکا لگا جب ان کے شاگردوں میں سے ایک جدوناتھ سنہا نے یہ الزام لگاتے ہوئے ان پر عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تھا کہ انہوں نے اس کے تھیسس میں سے مواد چرایا تھا اور پھر اس مواد کو اپنی کتاب ''Indian Philosophy'' میں بلا اجازت استعمال کیا تھا۔ رادھا کرشنن نے لگائے جانے والے تمام الزامات کو ماننے سے انکار کر دیا اور جواباً سنہا کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ بعد میں دونوں کے درمیان ان مقدمات پر سمجھوتہ طے پا گیا تھا۔ اس سمجھوتے کی شرائط کیا تھیں کوئی نہیں جانتا ہے۔

''Indian Philosophy'' کی دو جلدوں کی اشاعت نے ساری دنیا کی پروقار یونیورسٹیوں کے دروازے رادھا کرشنن پر کھول دیئے تھے۔ ڈاکٹری کی اعزازی اسناد، یادگار خطبات اور اعزازات جس میں ''نائٹ ہڈ'' بھی شامل تھا ڈاکٹر صاحب پر نچھاور کیے

گئے تھے۔ جن لوگوں نے ان کے خطابات کو سننے کے لیے مختلف تقریبات میں شرکت کی ان میں برٹرینڈ رسل اور ایچ۔ این۔ سپیلڈنگ بھی شامل تھے۔ سپیلڈنگ تو اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی مذاہب اور اخلاقیات کی باقاعدہ طور پر پروفیسری رائج کروائی اور پھر رادھا کرشنن پر اس عہدے کو قبول کرنے کے لیے دباؤ ڈالا تھا۔

پنڈت نہرو رادھا کرشنن کو ملک کی سیاسی زندگی کے منظر پر لے کر آئے تھے۔ نہرو نے ہی انہیں روس میں سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ سٹالن جس نے وجے لکشمی پنڈت کو ملنے سے انکار کر دیا تھا اس نے رادھا کرشنن کو ملاقات کرنے کے لیے بار بار بلایا تھا اور ان سے عقیدت و محبت کا یہاں تک مظاہرہ کیا کہ انہیں اپنے بالوں سے اٹھکیلیاں کرنے کی اجازت دی اور پھر ان کے گالوں کو پیار سے تھپتھپایا بھی تھا۔ نہرو نے اس امید پر انہیں نائب صدر منتخب کیا کہ پہلی ٹرم میں راجندر بابو کے سبکدوش ہونے کے بعد رادھا کرشنن ملک کے صدر بن جائیں گے۔ راجندر بابو نے سبکدوش ہونے کی خواہش کا واویلا کرنے کے باوجود ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا جبکہ رادھا کرشنن دوسری ٹرم میں بحیثیت نائب صدر کے خدمات سرانجام نہ دینے کا شور مچانے کے باوجود رضامند ہو گئے تھے۔ اس کہانی کو بھی ایک بار پھر دہرایا جانا تھا جب رادھا کرشنن صدر بنے تھے۔ جب ان کی ٹرم ختم ہونے کے قریب تھی تو اس بات کے پرزور اعلانات کے باوجود کہ وہ اپنی عالمانہ زندگی کی طرف واپس لوٹ جانا چاہتے تھے وہ دوسری ٹرم میں بھی صدر کے عہدے پر فائز رہنے کے خواہش مند تھے۔ اندرا گاندھی نے بھی نہایت گرمجوشی سے ان کے ساتھ اپنے سیاسی اقتدار کا آغاز کیا تھا لیکن رادھا کرشنن کی جانب سے اندرا گاندھی کے والد اور اس کے اپنے وزیروں پر کی جانے والی تنقید کے باعث اندرا گاندھی کا دل ان سے کھٹا ہو گیا تھا اور بالآخر اندرا گاندھی نے رادھا کرشنن پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ ذاکر حسین کے لیے جگہ خالی کر دیں۔ کوئی بھی ہندوستانی اقتدار کی کرسی اپنی مرضی سے نہیں چھوڑتا ہے اور رادھا کرشنن بھی کچھ مختلف نہ تھے۔

اس سال واقعی ایک نہایت شاندار اور بہت پیارے انسان کے متعلق بہت کچھ چھپا ہے۔ چھپنے والے اس مواد میں سے بیشتر تعریفی انداز میں لکھا گیا ہے (اور بے شک وہ تحسین کے لائق بھی ہیں) اور ان کی شخصیت کے نمایاں داغوں کو سامنے نہیں لاتا ہے۔

آئس کریم کا مہاراجا

میرا باپ پارٹیاں دینے میں بہت فیاض تھا۔ ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ دہ تیس سے زائد مہمانوں کو اپنے ساتھ پینے اور کھانے کے لیے بلایا کرتا تھا۔ اس کی طرف سے دی جانے والی دعوتوں میں کھانے کے لیے جو ڈشیں پیش کی جاتی تھیں ان کی فہرست کوئی اتنی لمبی چوڑی نہیں ہوا کرتی تھی۔ اگر چہ کھانے خوب نفاست سے پکائے جاتے تھے لیکن عموماً ہر بار ایک ہی طرح کے ہوتے تھے مثلاً سوپ، مچھلی، پلاؤ، چکن کڑاہی، دال اور سبزیاں عام طور پر بہترین آئٹم میٹھے کا ہوا کرتا تھا۔ ابا کی جانب سے پیش کی جانے والی آئس کریمیں بہترین ہوا کرتی تھیں اور اس کے مہمان نہایت شوق سے کھایا کرتے تھے۔

اس راز کا انکشاف مجھ پر بہت دیر بعد ہوا تھا۔ 1940ء میں لاہور کا رہنے والا ایک پنجابی نوجوان ابا سے ملنے آیا اور ان سے استفسار کرنے لگا کہ اسے ان کی جانب سے دی جانے والی پارٹیوں میں آئس کریم بنا کر پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ ابا اسے ایک موقعہ دینے پر رضامند ہو گئے پھر ہوا یوں کہ آئندہ آنے والی بہت سی پارٹیوں میں یہ جوان اور اس کا ایک دوست ہمارے گھر اپنی برف، مدھانی، قلمی شورہ اور آئس کریم کا مکسچر اٹھا کر لانے لگے۔ ہوتا یوں کہ جب مہمان کھانے کی میز پر بیٹھ جاتے تو وہ دونوں مل کر اپنے ہاتھوں سے آئس کریم بلونا شروع کر دیتے اور پھر تیار ہونے والی آئس کریم کو براہِ راست مہمانوں کو پیش کیا جاتا تھا۔ سب لوگوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ انہوں

نے اس سے پہلے کبھی ایسی مزیدار چیز نہیں چکھی تھی۔

یہ اس اقبال کے۔گھئی کا عاجزانہ سا آغاز تھا جسے بعد میں آئس کریموں کے مہاراجا کے خطاب سے نوازا گیا اور بی بی سی نے اسے دنیا کے سات سلیف میڈ افراد کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ گھئی 72 سال کی عمر میں لندن میں انتقال کر گیا تھا۔

اقبال مجھ سے پورے دو سال چھوٹا تھا (ہم دونوں کی تاریخ پیدائش ایک ہی تھی) لیکن میرے ابا کی اس سے محبت کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی بلکہ اس محبت کا باعث اس کی آئس کریم تھی۔ ابا نے ہی اسے ریگل بلڈنگ میں اپنی جگہ پر پہلا کوالٹی آئس کریم پارلر کھولنے کی اجازت دی تھی اور اس کے بعد برگر چیپس کی دکان اور گیلورڈز ریسٹورنٹ بھی ان ہی کا مرہون منت تھا۔ پھر گھئی نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ 1948ء میں وہ یورپ گیا اور آئس کریم تیار کرنے کے لیے جہاں کہیں سے بھی اسے بہترین سامان ملا اس نے خریدا اور پھر ملک کے تمام بڑے شہروں اور بیرون ملک (لندن' ہانگ کانگ' نیو یارک' شکاگو' کوبے' جدہ' شارجہ) ریستورانوں کی ایک چین قائم کر لی۔ جس بات کی بنا پر گھئی مجھے عزیز تھا وہ اس کا اپنے اُس دور کو کبھی نہ بھولنا تھا جب میرے باپ نے اسے زندگی میں آغاز کرنے کے لیے مواقع فراہم کیے تھے۔ جب بھی میرے ماں باپ انگلستان گئے تو اس نے ہمیشہ انہیں اپنے اپارٹمنٹ میں ٹھہرایا اور ان کی بالکل اسی طرح خدمت کی جس طرح ایک بیٹا اپنے ماں باپ کی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی نوازشوں کو اورنگ آباد میں تعمیر کیے جانے والے نئے ہوٹل رٹز میں میرے لیے بھی وسیع کر دیا تھا۔ جب میں ہوٹل چھوڑنے لگا اور میں نے اپنا بل طلب کیا تو وہ اتفاق سے سائیں بابا کے قدر آور رنگین پورٹریٹ کے پاس کھڑا تھا جس کی وہ دیوتا کی طرح پوجا کرتا تھا۔ گھئی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگا: ''کیوں شرمندہ کردے او مینوں؟'' اور پھر میرا بل پھاڑ ڈالا۔ یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔

مقدس برتری

خواتین کی آزادی کی علمبردار اور ''منوشی'' کی ایڈیٹر مدھوکشور کے خیال میں میرے جیسے مردوں کی دلچسپی کی چیزیں محض اس لیے نامعقول' احمقانہ اور بور کر دینے والی ہیں کیونکہ ہمیں ''ڈیبونیئر'' اور ''پلے بوائے'' میں لڑکیوں کی تصویریں دیکھنے کا بہت شوق ہوتا ہے جبکہ مجھے مدھوکشور کے جیسی عورتوں کی دلچسپیاں نہ تو نامعقول لگتی ہیں اور نہ ہی احمقانہ یا بور کر دینے والی بلکہ اس کے برعکس میرے نزدیک ان کی پسند انتہائی دانشمندانہ' دلچسپ اور جذبات برانگیختہ کر دینے والی ہے۔ میری تو بس اتنی سی تمنا ہے کہ کشور جیسی تمام خواتین کی پسندیدگیوں کا کسی ماہر نفسیات کے صوفے پر لٹا کر اچھی طرح تجزیہ کروں اور ان سے بازپرس بھی کیونکہ میں کشور کے جیسی عورتوں کے اب تک کیے جانے والے دعووں میں موجود بہت سی فضولیات کی شناخت کر سکتا ہوں۔ میرے اندر بھی اندل' مکتابائی' اکا مہادیوی لال دید اور میرا بائی جیسی بھگت شاعراؤں کی نفسیات میں جھانکنے کی خواہش موجزن ہے۔ ان سب عورتوں نے خود کو یوں ظاہر کر رکھا تھا کہ جیسے ان سب نے جسمانی ملاپ کو ٹھکرا دیا تھا' ساری عمر کنواریاں ہی رہی تھیں یا اپنے شوہروں کو فارغ کر دیا تھا اور بچے جننے سے تو بالکل ہی انکار کر دیا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کی شاعری کا نمایاں موضوع اپنے محبوب دیوتاؤں کے ساتھ محبت کی تکمیل کرنا ہی رہا تھا اور پھر مزے کی بات یہ کہ اپنے اس موضوع کے لیے استعمال کی جانے والی زبان ان مصنفوں کی استعمال کردہ زبان سے کچھ مختلف نہ تھی جو ہلکی پھلکی اشتہا انگیز تحریریں لکھتے تھے۔

ان سب کی شاعری خوبصورت اور مؤثر ہے کیونکہ اس میں بھرپور حساسیت پائی جاتی ہے۔''منوشی'' کے بھگت شاعرات پر چھپنے والے سب سے مشہور شمارے میں سے میں دو مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔اندل اپنی آرزو کو ان لفظوں میں بیان کرتی ہے:

''اے ٹھنڈے بادلو!
اس تک جاؤ جو کنول کی آنکھ والے دیوتا وینکتم
کے مقدس قدموں میں گرنے والے سمندر کو بلوتا ہے'
اور میری طرف سے درخواست کرو'
اسے بتاؤ کہ میری زندگی سرخرو ہو جائے گی
اگر' میرے ساتھ صرف ایک دن بیتانے وہ آ جائے'
اس کا مجھ میں سمانا میری چھاتیوں پر اپنے
تلک کا نشان چھوڑنے جیسا ہوگا''

اکا مہادیوی بھی اتنی ہی واضح ہے:

''او شِو!
میں کب تمہارا غرور اپنی صراحی دار چھاتیوں پر توڑ دوں گی
اے یاسمین کے پھول جیسے دیوتا!
اس جسم کی شرم اور
دل کی پاکبازی کو پرے پھینک کر میں کب تم سے ملوں گی!''

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے ہاں راجستھان کی میرا بائی کو بھگت شاعرات کی ملکہ تصور کیا جاتا ہے۔اس نے چتوڑ کے رانا کے ساتھ ہونے والی اپنی شادی کا ناس کر ڈالا تھا۔دیوتا کرشن کے ساتھ میرا کے شرمناک تعلقات کے جنون کے برملا اظہار ہی نے اس کے بے چارے شوہر کو اس قدر مجبور کر دیا کہ وہ اسے قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا لیکن ان سب سچائیوں کے باوجود وہ ہندوستان کی عظیم ترین شاعراؤں میں سے ایک تھی۔

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کوئی مرد پرست ہوں تو پھر جنوری تا جون 1989ء کے''منوشی'' کا شمارہ حاصل کیجئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے۔

❖ ○ ❖

وی پی سنگھ: سیاسی اصطبل کا جھاڑو

دو سال سے بھی زائد عرصہ قبل اس بات کی پیش گوئی کرنے کا سہرا میں اپنے سر باندھ سکتا ہوں کہ وی پی سنگھ ہندوستان کے اگلے وزیر اعظم ہو سکتے ہیں۔ میں نے 1987ء میں وی پی سنگھ کا ایک طویل انٹرویو کیا تھا (الہ آباد میں ان کی کامیابی سے کافی عرصہ پہلے) جو ''دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' میں چھپا بھی تھا۔ اس انٹرویو کو سرورق کی کہانی ہونا چاہیے تھا لیکن شائد ایڈیٹر کو اس بات کا پوری طرح یقین نہیں تھا کہ جو کچھ میں نے لکھا وہ ممکن بھی تھا۔ میں نے کچھ یوں لکھا تھا کہ چونکہ راجیو گاندھی کے بعد اس کی جگہ لینے کے لیے موجود امیدواروں میں وی پی سنگھ سب سے کامیاب امیدوار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے تھے اس لیے فیئر فیکس کے واقعہ کا منظر عام پر آنا اور پھر ان کی وزارت خزانہ سے وزارت دفاع میں کی جانے والی اچانک تبدیلی درحقیقت ان کی حکومت سے بے دخلی، معطلی اور پھر کانگریس پارٹی سے معزولی کے بعد ہی عمل میں لائی گئی تھی۔ راجیو کو درپیش مسائل ایک ایک کر کے نہیں آئے تھے بلکہ مسائل کی پوری فوج نے اس پر ہلہ بول دیا تھا پہلے فیئر فیکس اور پھر بوفورس کے مسئلے نے سر اٹھایا (جرمن آبدوز کا سودا) جو کہ بچن برادران کی کاروباری اخلاقیات کا شاخسانہ تھا۔ راجیو نے ان مسائل سے جان چھڑانے کے لیے اس طرح ہاتھ چلانے شروع کر دیئے تھے جیسے کوئی بھڑوں کے جتھے سے بچنے کے لیے چلانے لگتا ہے نتیجتاً اس کا سارا چہرہ بھڑوں کے ڈنکوں سے بھر گیا تھا کبھی 'مسٹر کلین' کے

نام سے یاد کیا جانے والا شخص اب ایک ایسے چہرے کا مالک بن گیا تھا جو ''بدعنوان' بدعنوان دوستوں کو پناہ دینے والا اور صدر کی توہین کرنے والا'' جیسے طعنوں سے سوج چکا تھا۔ دراصل کڑوے سچ سے آگاہ کرنے والوں کی قابل اعتماد نصیحت پر انحصار کرنے کی بجائے اس نے دنیش سنگھ جیسے مفاد پرستوں کی باتوں پر کان دھرنے شروع کر دیے تھے جو ہمیشہ سے خزانے کی کرسی پر ایک بار پھر براجمان ہونے کے لیے بے تاب تھے۔ یہی نہیں اس نے کے' کے تیواری جیسے منہ پھٹ اور کلپنا ناتھ رائے جیسے چاپلوسوں کو بھی ہر بات پر ہنہنانے کے لیے اپنے نزدیک کرلیا تھا۔ انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کے بعد صرف دو سال کے عرصے میں ہی راجیو گاندھی نے خود کو' ووٹ کھینچنے والا'' سے'' ووٹ گنوانے والا'' سیاستدان بنا لیا تھا۔ کانگریس کے اقتدار میں رہنے کے لیے ترپ کا پتہ ثابت ہونے والا اب پارٹی کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس کے ڈوبتے ہوئے جہاز سے راہ فرار اختیار کر لی تھی وہ سب کوئی اوباش لوگ نہیں تھے بلکہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اس ڈوبتے ہوئے جہاز کو بچانے کا واحد طریقہ اس کے کپتان کی تبدیلی تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ تب سے وی پی سنگھ کو مرکزی کابینہ میں شامل کرلیا گیا تھا اور پھر انہوں نے کانگریس پارٹی میں قائم بدعنوانی کے اصطبل کی صفائی کے لیے استعمال کیے جانے والے جھاڑو کا کردار نبھایا تھا۔ جنوری 1985ء میں شائع ہونے والی اپنی ایک مختصر سی نظم ''جھاڑن کا دھن'' میں انہوں نے لکھا تھا:

''مجھے وہیں رہنے دو جہاں میں ہوں
یہ تو صرف گرد ہے جو میں نے اکٹھا کی ہے
اگر تم نے مجھے مارا پیٹا
تو شاید
میں ہاتھ سے نکل کر بکھر جاؤں!''

خدا دشمن بھگوان

اچاریہ رجنیش کی وفات کا سن کر مجھے گہرا رنج ہوا تھا۔ میری رائے میں (جو بھی اس رائے کی قدر و قیمت ہے) وہ ایک ایسا سب سے اوریجنل مفکر تھا جو ہندوستان نے پیدا کیا تھا۔ یعنی انتہائی عالم و فاضل، سب مفکروں سے زیادہ واضح اور ان سب سے بالکل الگ تھلگ اور اچھوتا، ان تمام صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس میں الفاظ کو ادا کرنے اور لکھنے کی پیدائشی خوبیاں بھی موجود تھیں۔ آنے والی کئی دہائیوں میں ہم شاید اس جیسی کسی شخصیت کو نہیں دیکھ پائیں گے۔

رجنیش کے کرتبوں نے اس کے ایک شخصیت اور ایک فلسفی ہونے کی انتہائی غلط تصویر کشی کی تھی۔ رولز رائس کاروں کے بیڑے اور شاہانہ طرز زندگی، فری سیکس، مسلسل بدلتے ہوئے نام مثلاً اچاریہ سے بھگوان، میتر ئی بدھ سے اوشو وغیرہ یہ سب باتیں معمولی نوعیت کی ہیں۔ اس کو ایک مفکر کے طور پر پرکھا جانا چاہیے اور ایک مفکر ہونے کی حیثیت سے اس کا مقام دنیا کی قد آور شخصیات میں ہوتا ہے۔

اگرچہ اسے خدا کا پرچار کرنے والا کہا جاتا ہے لیکن رجنیش خدا پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے لکھا تھا: ''خدا' انسانی زبان میں سب سے بے معنی لفظ ہے۔'' مہاویر اور بدھ خدا پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ یہ کام ان کے چند بیوقوف چیلوں کا تھا۔ رجنیش کسی مذہب کو نہیں مانتا تھا۔'' تمام مذاہب نے انسانیت کو بھکاریوں میں بدل دیا تھا۔ وہ اسے عبادت اور پوجا

کا نام دیتے ہیں جو بدصورت حقیقت کو چھپانے کے لیے خوبصورت نام ہیں'' یہ اس کی تحریر تھی۔ ''تمام عقیدے اندھے اور جھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ سب آپ کو پھلنے پھولنے نہیں دیتے ہیں بلکہ یہ آپ کو محض مردہ جسموں' بوسیدہ بتوں اور قدیم فلسفوں کے سامنے غلاموں کی طرح گھٹنے ٹیکنے میں مدد کرتے ہیں۔'' وہ بعد از مرگ زندگی پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے لکھا: ''ہمارے پاس یہی ایک سیارہ' وقت اور زندگی ہے۔'' اس لیے جو کچھ یہاں سے مل سکتا ہے اس کے حصول کے لیے پوری کوشش کرو۔ ان مسائل پر غور وفکر کرنا تمہیں بے عقلی کے جالوں کو صاف کرنے میں مدد کرے گا اور تمہیں ذہنی سکون بخشے گا۔

اس عظیم آدمی کو چند الفاظ میں خراج تحسین پیش کرنا ناممکن ہے۔ میں اپنے قارئین کو اوشو کے لیکچرز پڑھنے کی تاکید کرتا ہوں جو اب اس کی سینکڑوں کی تعداد میں چھپنے والی کتابوں میں چھاپے گئے ہیں۔ رجنیش کے چلے جانے سے ہندوستان اپنے عظیم سپوتوں میں ایک سے محروم ہوگیا ہے۔ پوری دنیا میں پائے جانے والے کھلے ذہنوں کے لوگ ہندوستان کے اس نقصان میں برابر کے شریک ہوں گے۔

گاندھی خاندان کا گرو

دھریندر برہم چاری کے لیے میرے دل میں ہمیشہ ایک نرم گوشہ رہا ہے کیونکہ میں نے کبھی بھی اس کے برہم چاریہ طرز زندگی یا پھر یوگی ہونے کی نمائش کو سنجیدگی سے نہیں لیا ہے۔ اس کے تیکھے نین نقش' جسم کی خوبصورت ساخت' اس کا ہمیشہ صاف ستھرے دھوتی کرتے میں ملبوس رہنا (چاہے تیز دھوپ ہو یا برف باری) میرے دل میں حسد پیدا کرتا ہے۔ اگر وہ صرف یوگا تک ہی رہتا تو پھر شائد مجھے اس کے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ دراصل وہ اقتدار میں موجود لوگوں کو استعمال کرنے لگا تھا جس نے اسے آہستہ آہستہ طاقتور بنا دیا تھا اور یہی نہیں پھر اس طاقت کا نشہ اس کے دماغ کو بھی چڑھ گیا تھا۔ کئی سالوں تک اس نے مسز گاندھی اور اس کے خاندان کو ہپناٹائز کیے رکھا اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہمارے ملک میں ہوتا آیا ہی کہ مسز گاندھی کی کابینہ کے بیشتر سیاستدان دھریندر کی اس وقت تک چاپلوسی کرتے رہے تھے جب تک یہ سحر نہیں ٹوٹا اور مسز گاندھی اقتدار سے محروم نہیں ہوگئیں۔ کئی سالوں تک وہ دوردرشن پر دکھائے جانے والے یوگا پروگرامیوں کو بھی آلودہ کرتا رہا تھا۔ ایک سادہ زندگی جسے ہم عام طور پر یوگیوں کے ساتھ منسوب کرتے ہیں بسر کرنے کی بجائے وہ دولت سمیٹنے کے لیے کاروبار میں مشغول ہوگیا تھا۔ جموں میں لگائی گئی اسلحہ فیکٹری' ہریانہ میں قائم کیا گیا فلم اسٹوڈیو' نجی ہوائی جہاز اور بدیسی کار اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس مختصر سے عرصے کے دوران جب مسز گاندھی اقتدار سے باہر تھیں

دھریندر کے خلاف بہت سے مقدمات کیے گئے تھے اور ان مقدمات میں سے ایک مقدمہ بدکاری کا بھی تھا۔ مسز گاندھی کے اقتدار میں واپس آتے ہی دھریندر برہم چاری اپنے کاروبار اور دوردرشن پر واپس لوٹ آیا تھا۔ راجیو گاندھی کے دور میں اس کا مال ضرور پھر کم ہوگیا تھا لیکن کسی میں بھی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ دلی کے عین مرکز میں واقع اس کی ملکیت ''وشواتن یوگ آشرم'' سے اسے محروم کر سکے۔ اگرچہ آشرم کی مکمل مالی اعانت حکومت کے ذمے تھی لیکن اس کے باوجود آشرم کے ریکارڈ میں ایسے لاتعداد واقعات موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ حکومت سے تنخواہیں لینے والے ملازمین یا تو اسلحہ کی فیکٹری اور یا پھر فلم اسٹوڈیو میں کام پر معمور ہیں۔ اب تک کی جانے والی بہت سی انکوائریاں سوامی جی کے خلاف جا چکی ہیں۔ دلی ہائیکورٹ کے جسٹس بی۔ این کرپال نے اسے سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ اس کے عملے کی ایک بڑی تعداد نے بھوک ہڑتال کردی ہے کیونکہ انہیں پچھلے نو ماہ سے زائد عرصے کی تنخواہیں نہیں ملی ہیں۔

سوامی جی کے دل میں اخبار والوں کے لیے کوئی شفقت نہیں پائی جاتی ہے: ''تم سب کو رشوت دے کر ساتھ ملایا جاسکتا ہے۔ جب تک تم لوگوں کو کھانے میں مرغ اور بوتل نہ دی جائے تم کچھ نہیں لکھتے ہو۔ میں تم سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' یہ الفاظ سوامی جی نے ''پبلک ایشیا'' کے رمیش شرما کو اس وقت فون پر غراتے ہوئے کہے تھے جب شرما نے آشرم کے معاملات میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ ''میں نہیں چاہتا ہوں کہ بات بڑھ جائے'' جواب میں رپورٹر چلایا: ''میں بھی تم جیسے ڈھونگیوں اور پاکھنڈیوں کو اچھی طرح جانتا ہوں جو خوبصورت لڑکیوں اور شراب کے پیچھے مرے جاتے ہیں۔''

''تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟'' سوامی جی نے پوچھا۔

''نہیں میں نہیں جانتا!''

''پھر تم نے مجھے پاکھنڈی کیوں کہا؟''

''کیا تم مجھے جانتے ہو؟'' جواباً شرما نے پوچھا۔

''نہیں میں نہیں جانتا!''

''تو پھر تم نے مجھے شرابی اور مرغے اڑانے والا کیوں کہا؟''

میں نہیں جانتا کہ یہ مکالمہ اپنے اختتام کو کس طرح پہنچا تھا لیکن میں ایک دانشمندانہ اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آخر دھریندر برہم چاری کس طرح اپنے انجام کو پہنچے گا۔ وہ آدمی جو مذہب میں ہاتھ پاؤں صرف اس لیے مارتا ہے کہ اس کے جنموں کے پاپ دھل جائیں (یوگا ایک طرح کا مذہب ہے) وہ ذاتی تفاخر کا شکار ہوتا ہے۔

نئے وزیراعظم کی منحوس شروعات

مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت کتنے لوگوں نے اس فرق کو نوٹ کیا تھا کہ جب راشٹر پتی بھون میں ہونے والی تقریب حلف برداری میں نائب وزیراعظم چوہدری دیوی لال نے بھگوان کے نام کا حلف اٹھایا تو وزیراعظم چندر شیکھر نے بھی ایسا ہی کرنے کی بجائے نہایت پرتاثیر قسم کا حلفی اظہار پیش کیا تھا۔ مجھے یہ قیاس کرتے ہوئے دلی خوشی ہو رہی تھی کہ چندر شیکھر کا تعلق اس قبیل کے لوگوں سے ہے جو خدا یا آنے والے مستقبل پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور اس طرح سے وہ ان توہمات کی زنجیروں سے آزاد ہوگا جو اکثر مذہبی عقیدوں کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہیں لیکن بعد میں جو کچھ ہونے لگا تھا' اس کی وجہ سے مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ملک میں نمبرون بننے سے پہلے بھی چندر شیکھر نے عوامی سطح پر اعلان کر دیا تھا کہ وہ وزیراعظم کا حلف اٹھانے کے فورا بعد اپنے وزراء کے ناموں کا اعلان کر دیں گے۔ یہ اعلان جمعہ کے دن کیا گیا تھا۔ اگلے دن یعنی ہفتے کو انہوں نے اپنی کابینہ کا اعلان نہیں کیا اور وجہ یہ بتائی کہ ابھی انہیں لوک سبھا میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا تھا۔ 16 نومبر بروز جمعہ انہوں نے 215 ووٹوں کے مقابلے میں 280 ووٹ حاصل کر کے متوقع اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا۔ میں امید کر رہا تھا کہ اگلی صبح (ہفتہ) وہ اپنے وزراء کا اعلان کر دیں گے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ ہفتے کے دن کے ساتھ ساتھ اماوس کی رات بھی تھی اور یہ دونوں علامات جوتشیوں' قسمت کا حال بتانے

والوں اور توہم پرستوں کے نزدیک دوہری منحوسیت کا درجہ رکھتی تھیں۔ اعلان منگل کے دن پر ڈال دیا گیا جسے یہ سب لوگ کسی بھی نئی مہم کے آغاز کے لیے سب سے منحوس دن تصور کرتے ہیں۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ چندر شیکھر کو یہ سب احتیاطیں برتنے کے لیے ان کے سادہ لوح اور پھسڈی قسم کے لنگوٹیوں نے آمادہ کیا ہوگا کہ وہ ستاروں کے معاملے میں جلد بازی نہ کریں جو ان کی منزل کے رہنما ہیں۔ بالکل وی۔ پی سنگھ کی طرح جن کے پاس ایک جوتشی ہوا کرتا تھا جو کابینہ کے سیکرٹری کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دیا کرتا تھا (اور جس کی اپنے آقا کے عہدے پر فائز رہنے کے متعلق کی جانے والی پیشن گوئی افسوسناک حد تک غلط ثابت ہوئی تھی) چندر شیکھر کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ ایک ایسے دوست کی باتوں پر کان دھرتے ہیں جو علم نجوم سے اپنی روزی روٹی چلاتا ہے اور بہت سی غلط پیشن گوئیاں کر چکا ہے۔ چندر شیکھر نے اس ڈھونگی چندر سوامی کو اپنا قریبی دوست بتایا ہے۔ میرے خیال میں ایک ایسے شخص کو جو ملک کے سب سے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی ہے کہ وہ معیوب کردار کے حامل لوگوں کے ساتھ دوستانہ رکھے یا ایسے لوگوں کے زیر اثر فیصلے کرے جن کا کوئی سیاسی تجربہ نہیں ہے۔ شاید اس کو سمجھنے میں میری ہی کوئی غلطی ہو لیکن اگر میرا قیاس درست ہے تو پھر مجھے واقعی شدید مایوسی ہوئی۔

دنیا کا سب سے بڑا ساڑھی سٹور

مدراس میں نلی یعنی ایک ایسی دکان واقع ہے جو اب ملکی ادارے کی صورت اختیار کر چکی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسے پوری دنیا میں ساڑھیوں کی سب سے بڑی دکان ہونے کا اعزاز حاصل ہونا ہے۔ اس دکان کی لمبائی تقریباً سو گز ہے اور داخلی دورا ہے سے لے کر آخر تک اس دکان کے دونوں جانب موجود شیشے کے بنے قطار در قطار شوکیسوں میں مختلف رنگوں کی ساڑھیوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اس دکان کی اوپر والی دو منزلیں بھی زمینی منزل کی طرح خواتین کے استعمال میں آنے والے رنگین کپڑوں کی فروخت کے لیے مختص ہیں۔ دکان میں 360 سے زائد سیلز مین مقرر کیے گئے ہیں جو سب کے سب بے داغ سفید قمیضوں اور لنگیوں میں ملبوس اپنے ماتھوں پر مختلف انداز کے صندلی تلک لگائے کام میں مشغول نظر آتے ہیں۔

اس دکان کی یومیہ بکری 15 سے 30 لاکھ روپوں کی ہے۔ سالانہ فروخت کا تخمینہ 60 کروڑ کے انتہائی بلند ہندسوں کو جا چھوتا ہے۔ دکان کے مالک ''نلی کپوسوامی چیٹر'' داخلی دروازے کے قریب ہی ایک چھوٹے سے کیبن میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کے دفتر کا کل فرنیچر ان کی ایک میز کرسی اور مہمانوں کے لیے موجود تین کرسیوں پر مشتمل ہے۔ نلی صاحب اپنے کیبن میں بہت کم وقت گزارتے ہیں کیونکہ ہر چند منٹوں بعد انہیں سٹور میں کہیں نہ کہیں جانا پڑتا ہے۔ وہ صبح نو بجے دکان کھولتے ہیں اور سارا دن فروخت

اور ضرورت کے معاملات کی نگرانی کے لیے کبھی اوپر اور کبھی نیچے بھاگ دوڑ میں مصروف رہتے ہیں اور پھر آخر میں رات کو 10 بجے گھر واپس لوٹنے سے پہلے اپنے ہاتھوں سے دکان بند کرتے ہیں۔

اس کاروباری مرکز کی بنیاد کپوسوامی کے دادا نے رکھی تھی جنہوں نے آندھرا سے کانچی پورم ہجرت کی تھی جو کہ تامل ناڈو کی ریشم کی صنعت کا گڑھ ہے۔ کچھ سالوں تک ان کا معمول تھا کہ وہ مدراس میں بیچنے کے لیے اپنا سامان ہفتے میں دو بار بذریعہ ٹرین لاتے رہے تھے۔ پھر انہوں نے یہاں دکان کھول لی۔ اپنے بیٹوں کو انہوں نے کاروبار میں ساتھ لگا لیا تھا۔ کپوسوامی کی عمر اس وقت صرف 12 سال تھی جب ان کے والد چل بسے۔ ابھی انہوں نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی کہ انہیں سیلز مین بنا دیا گیا تھا۔

اس زمانے میں انہوں نے کاروبار پر زیادہ توجہ مدراس، مدورائی اور کوئمباتور میں دی تھی۔ کپوسوامی بارہا بیرون ملک جا چکے ہیں اور آج کل نئی دہلی اور شاید یورپ اور امریکہ میں بھی دکانیں کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نلی نے اتنی ترقی کیسے کی؟ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان کی دکان ہر طرح کے ذوق اور ہر طرح کی جیب کے لوگوں کو سامان بہم پہنچاتی ہے اور پھر دام بھی کم زیادہ نہیں کیے جاتے۔ 'فکس پرائس' کے اصول پر آپ سو روپے میں ایک سادہ سفید سوتی ساڑھی خرید سکتے ہیں جبکہ آٹھ ہزار روپے فی کس کے حساب سے بیش قیمت ساڑھیاں بھی دستیاب ہیں۔

کامریڈ سری پدڈانگے

کسی بھی ایسی شخصیت کے لیے جو ذرا کم مشہور ہے ضروری ہے کہ وہ اس دنیا سے کوچ کرنے کے لیے ذرا موزوں وقت اور دن کا انتخاب کرے۔ صبح 10 بجے سے شام 4 بجے تک کے اوقات مناسب ہیں کیونکہ یہ اوقات اخبار والوں کو تصاویر اور مرنے کی خبر تیار کرنے کی مہلت فراہم کر دیتے ہیں۔ مرنے کے اوقات سے بھی زیادہ اہم مرنے کے دن کا انتخاب ہے۔ ان دنوں سے خاص طور پر پرہیز کیجئے جب آپ سے زیادہ اہم کوئی شخصیت اپنے انجام کو پہنچتی ہے یا پھر کوئی زلزلہ یا طوفان آیا ہوا ہوتا ہے۔

یہ تمام سوالات اس وقت میرے ذہن میں بیدار ہوئے جب میں نے سری پدڈانگے کی 91 سال کی عمر میں ہونے والی وفات کے متعلق پڑھا۔ بیشتر اخبارات میں اس خبر کو درمیانی صفحات پر جگہ دی گئی تھی کیونکہ سب اخبارات کے پہلے صفحات راجیو گاندھی کے قتل کی خبروں کے لیے مخصوص تھے۔

سری پدڈانگے کی شخصیت صفحہ اول پر چھپنے سے تعلق رکھتی تھی کیونکہ ان کے سینے پر تحریک آزادی، میرٹھ سازش کیس اور انڈین کیمونسٹ پارٹی کی کئی دہائیوں تک رہنمائی اور اس کے علاوہ سکالرشپ کے حصول کے تمغے سجے ہوئے تھے۔ میں اس زمانے میں ان کی میزبانی کا شرف حاصل کر چکا ہوں جب میں ان کی شخصیت سے بالکل ناآشنا تھا۔ راج کے دنوں میں جب میں لاہور میں وکالت کر رہا تھا تو ان دنوں میرے ایک کیمونسٹ

دوست نے مجھ تک رسائی حاصل کی اور پوچھا کہ آیا میں ایک ایسے کامریڈ کو جو زیر زمین اور بیمار تھا اپنے پاس پناہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ ان دنوں سی آئی ڈی بھی اس کی تلاش میں تھی۔ میرا گھر اس لیے محفوظ تصور کیا جاتا تھا کیونکہ نہ تو میں سیاست میں تھا اور نہ ہی جمخانہ کلب میں گوروں کو اتنی لفٹ کرایا کرتا تھا لہٰذا میں پناہ دینے پر راضی ہو گیا۔

میں نے ڈانگے کو پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ دن میں جب میں ہائیکورٹ چلا جاتا تو انہیں میرے گھر کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی۔ اگر میرے گھر پر ہوتے ہوئے کوئی آ جاتا تو خود کو گھریلو ملازم ظاہر کرنا پڑتا تھا اور پھر باورچی خانے میں ہی رہنا پڑتا تھا۔ میں جب کبھی دوپہر کو کھانا کھانے یا پھر شام کو واپس آتا تو وہ کسی نہ کسی کتاب کے مطالعے میں منہمک دکھائی دیتے تھے۔ انہیں اسلامی تاریخ سے نمایاں دلچسپی دکھائی دیتی تھی۔

ان کی علمی صلاحیت نے اور جس باتحمل اور بامقصد انداز سے وہ تاریخی واقعات کا تجزیہ کیا کرتے تھے' اس نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ غیر ارادی طور پر انہوں نے بتایا کہ وہ میرٹھ سازش کیس میں ملوث تھے اور انہوں نے جیل میں اپنا بیشتر وقت تاریخ کی کتابیں پڑھ پڑھ کر گزارا تھا۔ انہیں پہچاننے میں مجھے چنداں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ''آپ یقیناً سری پد صاحب ہیں!'' میں نے کہا اور اس کے جواب میں وہ مسکرا دیئے تھے۔

ایک دن میری والدہ غیر متوقع طور پر آن پہنچیں اور انہوں نے ڈانگے کو نہایت پرسکون انداز میں صوفے پر براجمان کتاب پڑھتے ہوئے پایا۔ بعد میں والدہ نے میری اچھی خاصی کھنچائی کی کہ میں نے اپنے ملازموں کو بگاڑ رکھا تھا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ جب تم باہر ہوتے ہو تو یہ نیا ملازم تمہارے صوفے پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور تمہاری کتابیں پڑھتا رہتا ہے۔'' میری والدہ نے مجھے کہا تھا۔ دراصل میں والدہ کے سامنے ان کی حقیقت ظاہر نہیں کر سکتا تھا یہاں تک کہ والدہ کو تو ان کا نام بھی معلوم نہیں تھا لیکن اماں کا دل رکھنے کے لیے میں نے اس ملازم کو نکال دینے کا وعدہ ضرور کر لیا تھا۔

سری پد ڈانگے میرے پاس ایک ماہ سے زائد عرصہ ٹھہرے تھے۔ پھر ایک دن وہ بغیر کچھ بتائے غائب ہو گئے تھے۔ شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ میرے فلیٹ کی نگرانی

کی جا رہی تھی۔

برسوں بعد جب انگلستان میں میری ملاقات اپنے کالج کے پرانے دوست سی۔ ایچ ایورٹی سے ہوئی تو میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ آیا اسے معلوم تھا کہ سری ید اپنی مفروری کے دنوں میں میرے پاس چھپے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان ہی دنوں میں وہ سی آئی ڈی لاہور کا سربراہ تھا۔ ایورٹی میرے سوال پر مسکرایا اور کہنے لگا: ''بالکل ہمیں معلوم تھا اور تمہارا فلیٹ مسلسل ہماری نگرانی میں تھا۔'' ہم ڈانگے کو پکڑنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اس کی اور ان لوگوں کی حرکات وسکنات پر نظر رکھنا چاہتے تھے جو ان دنوں تمہیں ملنے تمہارے گھر آیا کرتے تھے۔

آزادی کے بعد جب ڈانگے دلی میں میرے ساتھ کھانا کھانے تشریف لائے تو میں نے ایورٹی سے ہونے والی بات چیت کا تذکرہ ان سے کر ڈالا تھا۔ ان کے خیال میں بھی ایسا ممکن تھا: ''اس وقت برطانوی حکمران کمیونسٹوں کو پکڑنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ تو انہیں کسی مناسب موقع پر قوم پرست طاقتوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے۔''

ٹیگور کا قومی ترانہ

اب جبکہ میں نے ٹیگور کی افسانہ نگاری پر تنقید کر کے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال ہی دیا ہے تو کیوں نہ لگے ہاتھ میں ایک اور متنازعہ مسئلے پر بھی بات کرلوں جو کہ اس ترانے جانا گانا مانا کی تخلیق کے متعلق ہے جسے آج ہم نے اپنے قومی ترانے کے طور پر اپنا رکھا ہے۔ بی جے پی کے ایک حالیہ اجلاس میں کارروائی کا آغاز ''جانا گانا مانا'' کی بجائے ''بندے ماترم'' سے ہوا تھا۔

یہ بات عین ممکن ہے کہ میسرز ایڈوانی اور مرلی منوہر جوشی کو یہ شک گزرا ہو کہ ''جانا گانا مانا'' کو جارج پنجم کی ہندوستان آمد کے اعزاز میں مرتب کیا گیا تھا۔ حالانکہ ٹیگور نے اس بات کی نفی کی تھی لیکن یہ شک تو اسی دن جنم لے چکا تھا جب اس ترانے کو پہلی مرتبہ عوام کے سامنے گایا گیا تھا۔ اس ترانے کو پہلی مرتبہ 1911ء میں کلکتہ میں ہونے والی آل انڈیا کانفرنس کے دوران گایا گیا تھا۔ کانفرنس کے اجلاس کا آغاز 26 دسمبر کو ''بندے ماترم'' سے ہوا تھا۔ اگلے روز یعنی 27 دسمبر کو بادشاہ جارج کو خوش آمدید کہنے کے لیے کی جانے والی تقریروں کے لیے مخصوص تھا۔

اسی روز ''جانا گانا مانا'' گایا گیا تھا۔ اس دن کے اجلاس کا اختتام راج بھوجہ دت چوھدری کے لکھے گیت ''بادشاہ ہمارا'' پر ہوا تھا۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے بہت سے اخبارات نے یہی سمجھا تھا کہ ٹیگور کا ترانہ بھی باقی گیتوں کی طرح ہی تھا۔ 28 دسمبر

1911ء کے ''دی سٹیٹس مین'' نے لکھا: ''بنگالی شاعر بابو رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک گیت گایا جسے انہوں نے شہنشاہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے بطور خاص ترتیب دیا تھا۔'' اسی تاریخ کو چھپنے والے ''دی انگلش مین'' نے لکھا: ''کارروائی کا آغاز بابو رابندر ناتھ ٹیگور کی جانب سے ایک گیت پیش کر کے کیا گیا جسے انہوں نے شہنشاہ کے اعزاز میں خاص طور پر ترتیب دیا تھا۔''

29 دسمبر 1911ء کے ''دی انڈین'' نے اسی بات کی ترجمانی کی اور لکھا: ''بدھ 27 دسمبر 1911ء کو جب انڈین نیشنل کانفرنس کے اجلاس کی کارروائی کا آغاز ہوا تو شہنشاہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے ایک بنگالی گیت پیش کیا گیا۔ شہنشاہ اور ملکہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے اتفاق رائے سے ایک قرارداد بھی منتخب کر لی گئی۔'' اگر ٹیگور کو اپنے اس ترانے کے متعلق اس طرح لکھنے پر کوئی اعتراض تھا تو پھر یہ بات تو طے ہے کہ اس وقت انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہونی چاہیے کہ اس وقت ہندوستان کے باشندے ہندوستان کے ساتھ وفاداری اور شہنشاہ کے ساتھ وفاداری میں کچھ فرق بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ جبکہ اس کے علاوہ شہنشاہ کا شکر گزار ہونے کے لیے بنگالیوں کے پاس ایک اچھی خاصی وجہ بھی موجود تھی کیونکہ شاہ نے 1905ء میں لارڈ کرزن کی جانب سے تجویز کی جانے والی بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی تھی۔ تقسیم کے اس منصوبے کا بنگالی ہندوؤں نے شدید برا منایا تھا۔

یہ تو بہت بعد کی بات ہے کہ جب ٹیگور نے بذات خود قطعی انداز میں کہا تھا کہ ''بھارت بھاگیہ ودھاتا'' کے الفاظ کا اشارہ بادشاہ یا ویلز کے شہزادے کی طرف نہیں بلکہ خدا کی طرف ہے۔ ہمیں یقیناً ''گرودیو'' کی بات مان لینی چاہیے۔

جب ملک کے لیے قومی ترانے کے انتخاب کا سوال آئینی اسمبلی کے سامنے پیش کیا گیا تو انتخاب ''بندے ماترم'' اور ''گانا مانا جانا'' میں سے کسی ایک کا کیا جانا تھا۔ اقبال کے ترانے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کو انتخاب میں شامل ہی نہیں کیا گیا کیونکہ اقبال کا شمار پاکستان کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ گاندھی جی ''بندے ماترم'' کے حق میں تھے۔

29 اگست 1947ء کو انہوں نے کہا کہ ''بندے ماترم کی دھن بنائی جانی چاہیے تاکہ لاکھوں افراد مل کر اسے گائیں اور اس کی سنسنی کو محسوس کر سکیں۔ ان سب کو ایک ہی لے تال میں اور ایک ہی بھاؤ (انداز) میں گانا چاہیے۔ شانتی نکیتن یا اس جیسے کسی اور قابل ادارے کو اس کی ایسی دھن تیار کرنی چاہیے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔''

جس بات نے فیصلہ ''گانا جانا مانا'' کے حق میں کیا وہ اس ترانے کو حاصل بنگالی حلقے کی مضبوط پشت پناہی تھی۔ یہ بات بھی سچی ہے کہ ملٹری بینڈ کے لیے ''بندے ماترم'' کی دھن کی نسبت ''جانا مانا گانا'' کی دھن بجانا زیادہ آسان تھا۔

❖ O ❖

بال ٹھاکرے کے لیے ایک مشورہ

بالآخر بال ٹھاکرے نے بھگوان کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس روشن خیالی تک پہنچنے کے لیے اسے ایک ذاتی نقصان (اس کی بیوی کی موت) کا سامنا کرنا پڑا جبکہ میں اس نتیجہ پر نصف صدی قبل بغیر کوئی نقصان اٹھائے ہی پہنچ چکا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ وہ لوگ جو خدا کے ہونے کا پرچار کرتے تھے ان کے دلائل کو غور سے سنا' پھر ان دلائل کے غیر منطقی ہونے کی بنا پر انہیں مسترد کر دیا اور نتیجتاً اپنے لیے ایک ایسا خود ساختہ مذہب ترتیب دے لیا جس میں خدا اور پرستش گاہوں یا پرستش کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ بات میرے دل میں گھر کر چکی تھی کہ واحد سچا مذہب جانداروں کے ساتھ محبت اور ماحول کا بچاؤ ہی تھا۔ اگر بالا صاحب یہی فیصلہ اپنی جوانی میں کر لیتے تو ہمارے ملک کی موجودہ صورتحال یکسر مختلف ہوتی۔ لیکن اس نے جوانی میں نہ صرف یہ غلطی کی کہ خود کو ایک اعلیٰ اور مہربان طاقت میں یقین رکھنے کے غیر منطقی عقیدے سے آزاد نہیں کروایا بلکہ جس مذہب (ہندوازم) میں اس نے جنم لیا اسی میں اپنا یقین اور پھر اسی کا پرچار بھی جاری رکھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے چکر میں دوسرے مذاہب کے احترام کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے آپ لوگوں کو اتنی زیادہ ذہنی مشقت نہیں کرنا پڑے گی کہ اگر لوگوں سے یہ کہنے کی بجائے کہ ''فخر سے کہو ہم ہندو ہیں'' یہ نعرہ بلند کیا جاتا کہ ''فخر سے کہو ہم ہندوستانی ہیں'' تو آج ملک کی صورتحال کیا سے کیا ہوتی اور اگر بابری مسجد کی

تباہی اور مسلمانوں کو سبق سکھانے پر فخر و ناز کرنے کی بجائے اس نے اپنے شیوسینکوں کو تمام طبقات اور مذاہب کے لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے کے لیے رضا کار فورس کی شکل میں منظم کیا ہوا ہوتا تو آج ہم کس قدر بہتر صورتحال میں ہو سکتے تھے یقیناً وہ ہمارے دل جیت سکتا تھا۔

بالا صاحب کے ہیرو چھتر پتی شیواجی کے خلاف ناقابل قبول تاثرات کے اظہار کے باوجود' جس کا مطلب اکثر و بیشتر اس کے قہر و غضب کو للکارنا تھا (اس نے مجھے بمبئی میں مارنے پیٹنے کی دھمکی دی تھی اور اس کے سینکوں نے فلورا فاؤنٹین کے مقام پر میرا پتلا نذر آتش کیا تھا) میں اس کی صاف گوئی کے ساتھ ساتھ وعدہ خلافی اور بدنظمی کے خلاف مضبوطی سے ڈٹے رہنے کی زیر لب تعریف بھی کرتا ہوں' اسے فقط اتنا کرنا ہے کہ اپنی نگاہوں کو بمبئی اور مہاراشٹر سے آگے بھی مرکوز کرے اور پورے ملک کے لوگوں سے بغیر کسی نسلی' مذہبی' ذات یا زبان کی تفریق کے مخاطب ہو۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو مجھے اپنا نام اس کے سینکوں کی فہرست میں درج کروا کے خوشی ہو گی۔

100 سال کا بوسارام

بوڑھوں کے اس بین الاقوامی سال کے دوران کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ جب آپ سو سال کی عمر کو پہنچیں گے تو آپ کے ذہن کی کیا حالت ہوگی؟ میں آپ لوگوں کو ایک ایسے آدمی کا قصہ سناتا ہوں جو اپنے عمر کے سو سال کر چکا ہے وہ دعا کیا کرتا تھا: ''کاش میں سو سال کی عمر پاؤں اور سو سال کی عمر میں بھی دیکھنے اور سننے کے قابل رہوں۔'' اب جبکہ بوسارام اپنے عزم میں کامیاب ہو چکا ہے' اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی رام داس اور دادا کالندہ رام سے ملنا چاہتا ہے۔ رام داس کافی عرصہ پہلے چل بسا تھا جبکہ دادا کالندہ رام کو بھی مرے ہوئے 60 سال بیت چکے ہیں۔ وہ سوال کرتا ہے کہ اس کی بیوی بھگوان دیوی کہاں چلی گئی ہے۔ وہ پندرہ برس پہلے اس دنیا سے کوچ کر گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ آدمی مرنے کے قریب ہوتا ہے تو ان لوگوں کو یاد کرنے لگتا ہے جو اس سے پہلے جا چکے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سب سے بڑے بیٹے کے پاس رہتا ہے لیکن پھر بھی اپنے ملازم سے کہتا ہے کہ مجھے چھمن داس (سب سے بڑے بیٹے) کے پاس لے چلو جس سے چار دنوں سے نہیں ملا ہوں۔ ماسوائے دودھ کے اس گلاس کے جو اسے سونے سے پہلے پینے کی عادت ہے اسے دن بھر کا کھایا پیا بھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بیٹی یا سب سے چھوٹے اس بیٹے کو بھی نہیں پہچان پاتا ہے جو اسے سب سے زیادہ عزیز تھا۔ پورے خاندان میں سے اسے صرف ایک نام یاد ہے اور وہ

ہے لکشمی جو اس کی سالی ہے کیونکہ صرف وہی ہے جو خلوص دل سے اس کی سیوا کرتی ہے۔ وہ اسے دعائیں دیتا ہے اور اس کی لگن کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے: ''یہ سب اس کو اپنے ماں باپ سے ملنے والی تربیت کی بدولت ہے۔''

اب اس کی دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے اور سننے میں بھی کسی حد تک مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی کل ملکیت ایک گٹھڑی ہے جس میں وہ ایک دھوتی' ایک چادر' ایک تولیہ اور ایک پیتل کا گلاس باندھے رکھتا ہے۔ اسے کوئی پریشانی نہیں ہے اور اس کے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے' وہ اس سے بالکل بے خبر ہے۔

بوسارام اکثر ان دنوں کو یاد کرتا ہے جب وہ وہاں ہوا کرتا تھا جسے اب پاکستان کہتے ہیں۔ وہاں وہ اپنے دوست جھانگی رام کے ساتھ کشتی کیا کرتا تھا۔ بوسارام اور جھانگی رام کے بیٹے نتھو اور پچھمن ایک دوسرے سے کشتی کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہ اور اس کا بھائی کپڑے کی ایک دکان اور گھی سٹور کے مالک تھے: ''اصل زمانہ تو وہ تھا ہر شے کی بہتات تھی دودھ پانچ آنے سیر تھا' اناج یا پانی کی کوئی قلت نہ تھی اور نہ ہی کوئی آلودگی ہوا کرتی تھی۔''

بوسارام کو کبھی بھی شدید بیماری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اگر آپ اس سے اچھی صحت کا راز پوچھتے تو وہ ہمیشہ سینہ ٹھونک کر جواب دیتا: ''تیل مالش۔'' ہر روز خدا کا شکر ادا کرنے سے پہلے کہ اس نے اسے ایک خوشحال اور صحت مند زندگی سے نوازا تھا وہ ڈنڈ بیٹھک اور تھوڑی سی سیر ضرور کیا کرتا تھا۔

اس کی خواہش ہے کہ جب وہ اس دنیا سے جائے تو اس کے تابوت کو غباروں اور جھنڈیوں سے سجایا جائے اور اس کے جنازے کے پیچھے بینڈ باجے والے ہوں۔ اس کی چتا کو جلانے کے بعد عزیز واقارب اور دوستوں کی ''پریتی بھوج'' میں تواضع کی جائے۔ وہ تین نسلوں کو اپنے سامنے جوان ہوتے ہوئے دیکھ چکا ہے اور اپنے جانے کے بعد وہ اپنے دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کے علاوہ 17 پوتے اور 19 پڑپوتوں کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔

❖ ○ ❖

''ذکرِ میر'' اور ''دِلّی''

اردو کے عظیم سخن وروں کی جو فہرست میں نے مرتب کر رکھی ہے۔ میر تقی میر (1723ء۔1810ء) اس فہرست کے پہلے پانچ سخنوروں میں شامل ہیں۔ میری دلچسپی کا محور اس شاعر کی بلند پایہ شاعری نہیں بلکہ اس کی اس دور کی وقائع نگاری ہے جس میں وہ زندہ تھا۔ ''دلی'' پر کام کرتے ہوئے (میرا ناول جسے میں نے زیادہ تر آنکھوں دیکھے احوال کو بنیاد بنا کر لکھا تھا) مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جس نے دلی آنے والے دو حملہ آوروں یعنی ایران سے نادر شاہ اور افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں دلی پر ٹوٹنے والی تباہی کو دیکھا اور قلمبند کیا ہو۔

اس تلاش کے دوران میں نے میر تقی میر کو پایا تھا۔ میر نے یہ سب واردات نہ صرف اپنی آنکھوں دیکھی تھی بلکہ قلم بند بھی کر رکھی تھی۔ میر آگرہ میں پیدا ہوا زندگی کا بیشتر حصہ دلی اور اس کے مضافات میں گزارا اور جب حالات ناقابل برداشت ہو گئے تو لکھنؤ ہجرت کر گیا جہاں اس نے وفات پائی' میر نے اپنی سوانح حیات فارسی میں قلمبند کی تھی۔ جیسا کہ مجھے فارسی نہیں آتی ہے اس لیے مجھے اس سوانح حیات کے اردو ترجمے پر اکتفا کرنا پڑا تھا۔ میر نے اپنی ذات' معاشقوں' بیوی اور بچوں کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا لیکن اس کی سوانح حیات کا زیادہ تر حصہ اپنے باپ' دوست احباب' سرپرستوں اور ساتھی شعرا کے متعلق تفصیلات پر مشتمل ہے۔

اپنے تخیل کی مدد سے میں نے میر کی زندگی کی نجی تفصیلات مرتب کرنے کی کوشش کی تھی اور ان تفصیلات کے تخیل کے آ خذ اس کی نظمیں تھیں جو میں نے ترجمہ کر رکھی تھیں مجھے معلوم تھا کہ میرے پڑھنے والے میری اس جسارت کو معاف کر دیں گے کیونکہ میری کتاب حقیقت اور فسانے کا آمیزہ تھی۔ اس کے بعد جو بہترین چیز مجھے حاصل ہوئی وہ میر کی سوانح حیات کا مستند ترجمہ تھا۔ یہ ترجمہ شکاگو یونیورسٹی میں تعینات اردو کے پروفیسر سی ایم نعیم کا کیا ہوا تھا جسے ''ذکر میر (Zikr-i-Mir) کے نام سے چھاپا گیا تھا۔ سی ایم نعیم نے 1707ء میں شہنشاہ اورنگزیب کی وفات سے لے کر 1803ء میں برطانویوں کے دلی پر قبضہ کر لینے تک کے تحت زمانہ ابتری کے دوران پروان چڑھنے والے میر تقی میر کے بچپن' لڑکپن اور شاعری کے دور کے پس منظر کو تحریر میں لا کر ایک گرانقدر خدمت سرانجام دی ہے۔ ایرانیوں اور افغانوں کے علاوہ مرہٹوں' جاٹوں' روہیلوں اور سکھوں نے دلی میں اس وقت تک لوٹ مار کا بازار گرم کیے رکھا جب تک اس شہر میں لوٹنے کے قابل مزید کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ جب لوٹنے کو مزید کچھ نہ رہا تو ان مال غنیمت لوٹنے والوں نے دلی کے محلوں کو نذر آتش کیا' اس کے رہنے والوں کا قتل عام کیا اور یہاں کی عورتوں کو اغوا کرنے کے بعد زیادتی کا نشانہ بنا ڈالا تھا۔ میر کی نظروں نے جو کچھ دیکھا' اسے میر نے خون کے آنسو روتے ہوئے قلم بند کیا تھا۔ اپنے ناول کے لیے میر کا افسانوی کردار تخلیق کرنے کے لیے جو کچھ میرے علم میں تھا اس سے کہیں زیادہ میں نے نعیم کے ترجمے سے حاصل کیا تھا۔ مثال کے طور پر یہ بات مجھے ہرگز معلوم نہ تھی کہ اس زمانے میں ہم جنس پرستی قابو سے باہر ہوا کرتی تھی اور لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کی محبت میں مبتلا ہونا کہیں زیادہ عام تھا۔ یہ بات بھی میرے علم میں نہ تھی کہ اس دور میں فقیر' درویش اور ملنگ وغیرہ جو اپنا بیشتر وقت عبادت اور مراقبے میں گزارا کرتے تھے ان کے نزدیک ہم جنس پرستی کوئی اتنا بڑا گناہ نہیں تھا۔ یہ بھی میرے علم میں نہیں تھا کہ اس زمانے کے مصنفین کے لیے اپنی کتب کے آخر میں اپنے پسندیدہ لطائف درج کرنے کا رواج پایا جاتا تھا۔ ''ذکر میر'' کے ترجمے کے آخر میں نعیم نے میر کے چند پسندیدہ لطائف درج کیے ہیں' ان لطائف میں کچھ تو اس قدر فحش ہیں کہ کسی بھی ہندوستانی اخبار کا ایڈیٹر اس کتاب پر لکھے

جانے والے تبصرے تک میں ان لطائف کا ذکر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے۔

کتاب کے اضافی مواد میں نعیم نے میر کے تصور محبت پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے باپ کی طرح میر نے بھی عشق کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس کی تحریروں میں عشق مجازی کی نسبت عشق حقیقی کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔ یہ مصدقہ بات ہے کہ میر کے چند شادی شدہ خواتین کے ساتھ معاشقے رہے تھے اور ان خواتین کی آج تک شناخت نہیں ہو سکی ہے۔ یہ وہ عوامل ہیں جو میر کی خودنوشت کا مایوس کن خلا ہیں۔ اپنے ناول میں ان خلاؤں کو میں نے اپنے تخیل کو استعمال میں لاتے ہوئے پر کیا تھا مجھے امید ہے کہ میر صاحب اپنی نجی زندگی میں اس دخل اندازی پر مجھے معاف فرمائیں گے۔

مجھے اس کتاب (ذکر میر) کے اضافی مواد میں میر کی نظموں کے تراجم ملنے کی بھی امید تھی مگر افسوس نعیم نے خود کو صرف ان اشعار کا ترجمہ کرنے تک محدود رکھا جو ''ذکر میر'' کے متن میں قلم بند کیے گئے تھے۔ جس انداز میں وہ انگریزی زبان کو استعمال میں لاتا ہے اسے دیکھتے ہوئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کم از کم میر کے مشہور کلام میں سے چند نظموں کا بطریق احسن (مجھ سے کہیں بہتر ترجمہ کر سکتا ہے) میں نے اپنے ناول میں میر کے کلام سے کچھ اقتباسات کا ترجمہ کرنے کی جسارت کی ہے۔ مے نوشی پر میر لکھتے ہیں:

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں
مستی سے درہمی ہے میری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو میں نشے میں ہوں
یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے!
یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشے میں ہوں
نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں!

دوسرا قطعہ تو اردو شاعری کے قدر دانوں کو حفظ ہے۔ اسے میر نے لکھنؤ میں

اپنے پہلے مشاعرہ میں شرکت کے موقع پر لکھا تھا۔ سامعین اس کے شکن آلود لباس اور بھدی وضع قطع پر مسکرا رہے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ وہ تشریف کہاں سے لائے تھے۔

کیا بُود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی کہ ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار

محسنِ ہند: سی پی راماسوامی

جب ہم جدید ہندوستان کے معماروں کے متعلق بات کرتے ہیں تو معماروں کی اس فہرست کو تلک' گوکھلے' سی-آر-داس' گاندھی' نہرو' سروجنی نائیڈو اور چند دوسرے نمایاں سیاستدانوں اور سماجی کارکنوں تک محدود کر لیتے ہیں۔ جنوبی ہندوستانیوں کی موجودہ نسل کے زیادہ تر نوجوان اُس شخص کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں جو ہندوستان کی شکل وصورت میں کئی لحاظ سے تبدیلی لانے والے افراد کی فہرست میں اول مقام کا مستحق ہے۔ اس شخصیت کا نام سی-پی-آر-آئیر تھا۔

دس سال کے عرصے میں وہ ٹراونکور کے دیوان بنے' لازمی پرائمری تعلیم کا آغاز کیا' ''دلتوں'' کے مندروں میں داخلے کی آزادی کی تحریک کے رہنما بنے اور اس کے علاوہ وہ مختلف نہروں' ڈیموں' ہائیڈرو الیکٹرک ورکس اور کھادی پودوں کے منصوبوں کے معمار بھی تھے۔ سی-پی-راماسوامی آئیر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن' اینی بیسنٹ کے قریبی دوست' موتی لعل نہرو اور بہت سے قوم پرست رہنماؤں کے قانونی مشیر تھے۔ وہ تین یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بنے اور انہوں نے تیسری گول میز کانفرنس میں ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سی خدمات سرانجام دیں۔

میں نے انہیں پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا جب وہ پنجاب یونیورسٹی' لاہور میں

سالانہ کانووکیشن سے خطاب کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ نکھری رنگت' عقابی چہرے اور لمبی لمبی پلکوں کے ساتھ وہ ایک انتہائی جاذب نظر شخص دکھائی دے رہے تھے۔ قدرت نے انہیں الفاظ کی دولت سے بھی خوب نوازا تھا۔ ان دنوں یہ افواہ بھی گردش کر رہی تھی کہ لیڈی ولنگڈن ان پر فدا تھی۔ جس رفتار سے انہوں نے ترقی کے مدارج طے کیے اس کے بدلے انہیں بے پناہ تعظیم ملی تھی۔ یہ بات سنا کر انہوں نے لاہور کانووکیشن کو قہقہوں سے بھر دیا کہ وہ ''میم صاحب'' جنہیں ان کو ''دیوان'' پکارنے میں دشواری پیش آتی تھی' انہیں ''ڈیئرون'' کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔

مجھے 1950ء میں انہیں لندن میں واقع اپنے گھر میں ڈنر پر مدعو کرنے کا اعزاز حاصل رہ چکا ہے۔ اس وقت وہ کافی ضعیف ہو چکے تھے اور دعوت میں آنے کے لیے انہیں اپنے بیٹے کا سہارا لینا پڑا تھا۔ لیکن عمر کے اس حصے میں بھی وہ ہمیشہ کی طرح زندہ دل تھے۔ میری ان کے خاندان کی چار پیڑھیوں سے جان پہچان رہ چکی ہے۔ ان کی پوتی شکنتلا جگناتھن سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی جو اس وقت مغربی اور وسطی علاقوں کے ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کی ڈائریکٹر تھی اور اس نے ہندوازم پر مفید کتابیں بھی لکھ رکھی تھیں۔ پھر میری ملاقات ان کی بیٹی نندیتا کرشن سے ہوئی۔ آخری بار جب میں چنائے میں تھا تو نندیتا نے مجھے کئی ایکڑ پر محیط اور قدیم درختوں کے جھنڈ میں ایستادہ اپنے آبائی گھر "The Grove" میں لنچ پر بلایا تھا۔ دونوں ماں بیٹی کو نین نقش' سر سی۔ پی سے ورثے میں ملے تھے۔ نندیتا کئی کتابوں کی مصنفہ اور کیف آور حسن کی مالک ہے۔ ذہانت اور حسن کا اتصال انتہائی مہلک ہوتا ہے۔

شکنتلا جگناتھن نے اپنی کتاب (C.P.Remembered) میں اپنے دادا کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ کتاب اس عظیم خاندان کے سربراہ سی پی راماسوامی کی یادوں کے مجموعے پر مشتمل ہے۔ وہ کہتی ہے کہ دادا جی کا جنم 1879ء کی دیپاولی کے دن واندی وش کے مقام پر ہوا تھا۔ دادا کے ابا نے ان کی جنم کنڈلی ایک یورپی اور ایک ہندوستانی نجومی سے بنوائی تھی۔

دونوں نجومیوں کا کہنا تھا کہ وہ کبھی کسی امتحان میں کامیابی حاصل نہیں کر سکیں

گے۔ مگر دادا نے ہر امتحان میں پہلی پوزیشن لینے کا سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ انہیں ''پرائز بوائے'' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ وہ انتہا کے پڑھاکو تھے۔ تامل' سنسکرت' انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے' انہوں نے بھرپور استفادہ کیا' انہیں ریاضی سے بھی بہت لگاؤ تھا۔

دادا وکیل نہیں بننا چاہتے تھے لیکن ان کے ابا انہیں بہلا پھسلا کر قانون کے پیشے میں لے آئے تھے۔ یہ ایک تاملی توہم ہوا کرتا تھا کہ کسی بھی نئے کام کا آغاز منگل کے دن سے نہیں کرنا چاہیے۔ دادا نے مدراس بار میں شامل ہونے کے لیے منگل کا دن چنا تھا۔ ان کی پریکٹس کے پہلے سال کی آمدن 104 روپے تھی۔ 6 سال بعد ان کی آمدن کسی بھی دوسرے وکیل سے زیادہ ہو چکی تھی۔ انہیں بنچ میں ایک نشست کی پیشکش کی گئی۔ انہوں نے اس پیشکش کو بے کار گردانتے ہوئے مسترد کر دیا۔ انہوں نے لکھا: ''مسٹر چیف جسٹس! میں ہر روز صبح سے شام تک فضولیات سننے کی نسبت روزانہ چند گھنٹے فضولیات کہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔''

دادا کا عروج آناً فاناً تھا۔ ان کا سب سے زیادہ تخلیقی دور ٹراونکور کے مہاراجا کے ہاں ملازمت کے دوران کا تھا۔ کیرالہ کی سو فیصد شرح خواندگی دادا کے متعارف کروائے جانے والے اقدامات کی مرہون منت ہے جبکہ ریاست اور اس کے گرد و نواح میں آنے والی زرعی اور صنعتی خوشحالی کا سہرا بھی ان کی متعارف کردہ سکیموں کے سر ہے۔ وہ مہاراجا کے انتہائی وفادار تھے اور آزادی کے موقع پر انہوں نے ''آزاد ٹراونکور'' کی درخواست کی تھی۔ ان کے پسندیدہ ترین ہیرو ''نیوسان'' تھے اور ان کی تائید میں اکثر ملٹن کا یہ قول دہرایا کرتے تھے: ''مضبوط' بے لوث' بے خوف' اپنی وفاداریوں کا محافظ''۔

دادا اوٹی کے مقام پر ریٹائر ہونا چاہتے تھے لیکن ایسا نہ ہو سکا' انہیں نہرو نے مشاورت کے لیے بلا بھیجا اور پھر انہیں ہندوستان کی جانب سے کشمیر کا معاملہ پیش کرنے کے لیے اقوام متحدہ بھجوایا گیا۔ اگر کرشنا مینن خود کو نمایاں کرنے کے بجائے دادا کو اپنا کام کرنے دیتے تو آج کشمیر کی جو صورت حال ہمارے سامنے ہے وہ نہ ہوتی۔ ایک بار جب وہ ٹراونکور لوٹے تو ہزاروں کی تعداد میں شہری ان کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے۔

اس دوران ان پر قاتلانہ حملے کی کوشش کی گئی۔ اس قاتلانہ حملے کے مقاصد کیا ہو سکتے تھے یا انہیں اس سے کیا نقصان پہنچا۔ اس بارے میں شکنتلا ہمیں کچھ نہیں بتاتی ہے۔ میرے دوست جی۔ آر کرشنا نارائن جو کہ لکشو ادیپ کے ریٹائرڈ پرلیس افسر ہیں اپنے ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں: ''عالم فاضل سی۔ پی۔ راما سوامی کی رائے میں قاتلانہ حملے کی یہ کوشش ان کی جان لینے کے لیے نہیں بلکہ ان کا چہرہ مسخ کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ لیکن کوئی بھی کوشش پروان نہ چڑھ سکی۔ دادا زخموں سے صحت یاب ہو گئے اور ان کے پُرکشش چہرے کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ ان کا انتقال 87 سال کی عمر میں لندن کے مقام پر ہوا۔''

چیتن آنند

گورنمنٹ کالج لاہور میں گزارے جانے والے دو سالوں کے دوران میری شناسائی ایسے بہت سے لوگوں سے ہوئی تھی جنہوں نے آنے والے وقتوں میں فلمی دنیا میں عروج حاصل کیا۔ بلراج ساہنی مجھ سے دو سال سینئر ہے۔ ان کا چھوٹا بھائی بھیشم' بی۔آر۔چوپڑا اور چیتن آنند میرے ہم جماعت تھے۔ دیوآنند اور اوما کوشپ جنہوں نے کامنی کوشل کے نام سے عروج حاصل کیا۔ مجھ سے چند سال جونیئر تھے۔ ایک اور جونیئر آئی۔ایس۔جوہر تھے جو اس وقت ایف۔سی کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ آنے والے سالوں میں ان شخصیات میں سے بیشتر میری زندگی میں دوبارہ ابھر آئی تھیں۔ لیکن لاہور میں گزارے جانے والے ان دنوں میں چیتن آنند میرا قریب ترین ساتھی تھا۔ وہ ایک اچھا خاصا کیریکٹر ہوا کرتا تھا۔

گھنگھریالے بالوں اور حساس آنکھوں والا چیتن آنند ایک خوبصورت لڑکا تھا' ایسے وجیہہ لڑکے جو نازک لڑکوں پر مر مٹنے والے ہوتے ہیں۔ چیتن ان سے یوں بچتا جیسے وہ کوئی طاعون کی بیماری ہوں اور ہر وقت میرے ساتھ چمٹا رہتا۔ اگرچہ ہم منہ زبانی کافی چسکے لیا کرتے لیکن ہمارے تعلقات میں ہم جنس پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہم کالج سے ہاسٹل ایک ساتھ واپس لوٹتے' جماعت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اور مل کر ٹینس کھیلتے اور فلمیں دیکھنے جاتے۔

میری طرح وہ بھی آئی۔سی۔ایس (I.C.S) میں جانے کا آرزومند تھا۔اس کے لیے وہ امتحان دینے انگلستان بھی گیا تھا لیکن ہم دونوں مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اتر سکے۔ میں قانون کی ڈگری حاصل کر کے لاہور آیا اور اس نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ان دنوں وہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

اس نے گرمیاں میرے اپارٹمنٹ میں گزاریں' میں نے چیتن کی شخصیت کا دوسرا رُخ اس وقت دیکھا جب عورتوں کو اس میں انتہائی کشش محسوس ہوتی تھی اور چیتن کے پاس ان کے دلوں میں گھر کر جانے کا منفرد انداز موجود تھا۔تھوڑی پر خشخشی داڑھی سجائے اور ہاتھ میں فقط ایک پھول تھامے وہ اپنی محبوباؤں سے ملنے کے لیے جون کے گرم ترین مہینوں میں بھی اپنا اوور کوٹ پہن کر چلا جاتا۔عموماً گفتگو کا آغاز یوں ہوا کرتا۔کہ خوبرو حسینہ اس سے پوچھتی کہ آخر اس نے اس گرمی میں یہ اوور کوٹ کیوں پہن رکھا ہے؟

''میرے پاس اس دنیا میں صرف یہی بچا ہے۔'' یہ جملہ وہ جواباً اس کی خدمت میں واحد پھول نذر کرتے ہوئے ادا کیا کرتا تھا۔چیتن کی کامیابی یقینی تھی۔حسب معمول وہ پوری یونیورسٹی کی منظور نظر لڑکی ادما چیٹر جی کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔اگرچہ وہ عیسائی تھی لیکن اپنے ماں باپ کی پروا کیے بغیر ایک ایسے ہندو سے شادی کے لیے تیار ہو گئی تھی جو اس وقت تک بے روزگار تھا۔

دونوں کی منگنی طے پا جانے کی خوشی میں' مَیں نے ایک عظیم الشان پارٹی دی۔ مجھے چیتن کے کردار میں متلون مزاجی دکھائی دی۔ پارٹی کے دوران وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ انتہائی شرمناک حد تک دل لگیوں میں مصروف رہا۔اگلی صبح جب میں نے اس کی سرزنش کی اور اسے ''حرامی'' کہا۔تو وہ ہتھیار ڈالنے کے سے انداز میں مسکرا دیا اور اس نے میرے احتجاج کو یکسر نظرانداز کر دیا۔چیتن اور ادما نے شادی کر لی اور ان کی دو بچے ہوئے۔ادما اس کی عشق بازیوں کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر پائی اور اس نے چیتن کو چھوڑ کر القاضی سے شادی کر لی۔ چیتن ایک نوعمر سکھ لڑکی کے ساتھ رہنے لگا جو اس کی بیٹی لگتی تھی۔ نے ایک دوسرے سے ملنا جلنا جاری رکھا میں اسے اس کی فلموں کے متعلق لکھتا رہتا تھا اس نے ایک ہی اچھی فلم بنائی تھی۔

اس نے دہلی کے لال قلعے پر کچھ پروگرام بنائے تھے جن کا اسکرپٹ میں نے لکھا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ چیتن نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ ان پروگراموں کو لکھا بھی اس نے خود ہی ہے لیکن جب میں نے اس ضمن میں اس سے سوال کیا تو اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ اس نے کبھی ایسا کیا ہی نہیں۔ جب میں ''دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' کی ادارت سنبھالنے کے لیے بمبئی منتقل ہوا تو میں نے لاہور کے اپنے ان دوستوں کے ساتھ روابط کی تجدید کرنے کی کوشش کی جو اب فلمی دنیا کے بڑے نام بن چکے تھے سب سے زیادہ کوشش چیتن آنند کے ساتھ رابطہ کی بحالی کے لیے کی جس نے لاتعداد موقعوں پر میری میزبانی کے مزے لوٹے اور جو میرا سب سے قریبی دوست بھی تھا۔ جوہو میں واقع بلراج ساہنی کے بنگلے پر میں نے ہفتے کی کئی شامیں گزاری تھیں۔ کامنی کوشل کی طرح بی-آر-چوپڑہ نے بارہا مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔ ہفتے میں ایک بار میں آئی-ایس جوہر اور اس کی سابقہ بیوی راما ہنس کے ساتھ کھانا کھایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے دیو آنند نے اپنی بڑی بڑی کاک ٹیل پارٹیوں میں بھی مدعو کیے رکھا لیکن وہ چیتن آنند جس سے میں کسی بھی دوسرے دوست کی نسبت ملاقات کے لیے زیادہ بے چین تھا' اس نے انتہائی پُراسرار طور پر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا' اس کی پبلسٹی کے لیے جب اسے ضرورت پڑتی تو وہ مجھے بار بار فون بھی کرتا اور عام طور پر گفتگو اس رسمی جملے پر ختم ہوتی: ''کبھی ہمارے گھر آنا۔''

مجھے بہت مایوسی ہوئی اور شدید غصہ بھی آیا۔ بمبئی سے واپس آنے سے چند ماہ پہلے میں چیتن اور اس کی محبوبہ کو ملنے ایک پارٹی میں گیا ہوا تھا اس لڑکی نے مجھ سے کہا: ''تم ہمارے گھر کیوں نہیں آتے۔'' میں پھٹ پڑا ''کیونکہ تمہارے اس کمینے دوست نے کبھی مجھے آنے کے لیے کہا ہی نہیں۔'' چیتن نے اس بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ ''سردار تم مجھ سے بہت ناراض ہو۔ اچھا بتاؤ کب آ رہے ہو؟'' میں فریب برداشت نہیں کر سکا: ''کبھی نہیں'' میں چلایا' ''تم ایک انتہائی بے شرم مطلبی انسان ہو تمہیں میری مہینوں کی میزبانی کا ذرا بھی پاس نہیں آیا۔'' لوگوں کو فیاضوں اور منگتوں' لالچیوں اور طفیلیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے' جن منگتوں اور طفیلیوں سے میری زندگی میں ملاقات رہی چیتن آنند ان میں سب سے بڑا منگتا اور طفیلیہ تھا۔

❖ ○ ❖

بلونت گارگی

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میری اور بلونت گارگی کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ یہ میرے لاہور کے دنوں (47-1940ء) کی بات ہے کہ میں اپنی پنجابی بہتر کرنے کی کوشش کر دیا تھا جو میں نے اپنے آبائی گاؤں ''ہڈالی'' میں سیکھی تھی' اپنی والدہ کے لکھے خطوں کو پڑھنے اور انہیں خط لکھنے کے لیے میں نے اس زبان کو سمجھنا جاری رکھا۔ کیونکہ میری ماں کو اور کوئی زبان نہیں آتی تھی۔ پنجابی ادب میں سوائے ان چند الہامی فقروں کے جو ہمیں اپنی عبادت کے لیے زبردستی رٹائے جاتے تھے اور کسی چیز کے بارے میں علم نہیں تھا۔ میری سمجھ میں یہ کبھی نہیں آیا کہ ان کا مطلب کیا تھا؟

ہندوستان واپس آنے پر میں نے بھائی ویر سنگھ کی شاعری پڑھنے کی کوشش کی۔ ان کی چند نظموں کو میں نے کافی سحر آفرین پایا۔ لیکن اس کے باوجود میں بھائی ویر سنگھ کی رزمیہ نظموں کو اُس طرح سمجھ نہیں پایا جس طرح پنجابی دان ان کے جذبات کو سمجھتے تھے۔ نانک سنگھ (اور مانیں یا نہ مانیں ماسٹر تارا سنگھ) جیسی مشہور شخصیات کے بارے میں لکھے ہوئے ناولوں کو میں نے یکساں طور پر دوسرے درجے کا پایا۔ یقیناً پنجابی ادب میں ان کاموں سے بہتر کئی کام کیے جا چکے تھے۔

کیونکہ میرے پاس قانونی کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے میں قانون کی کتابیں پڑھنے کی بجائے اپنا بیشتر وقت انگریزی' اردو اور پنجابی ادب کے کلاسیکی شعرا اور

ناول نگاروں کو پڑھ کر گزارہ کرتا تھا جہاں تک پنجابی ادب کا تعلق ہے' تو میں نے اس کا آغاز شاعر موہن سنگھ (ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ) سے کیا جو اس وقت سکھ نیشنل کالج میں پروفیسر تھے۔ میں نے اب تک جتنی نظمیں پڑھی ہیں موہن سنگھ کی نظمیں ان سب سے بدرجہا بہتر تھیں۔ میں نے انہیں گھر بلایا اور پھر وہ میرے گھر باقاعدگی سے آنے لگے اور پھر انہوں نے میرا تعارف پروفیسر تیجا سنگھ اور کرتار سنگھ دگل سے کروایا جنہوں نے انگریزی اور گورمکھی میں کئی کتابیں لکھی تھیں۔ شاید انہیں لوگوں میں سے کسی نے گارگی کا مجھ سے ایک ابھرتے ہوئے ڈرامہ نگار اور نثر نگار کی حیثیت سے تعارف کروایا تھا۔ اس زمانے میں ایسے ہندوؤں کی تعداد بہت کم تھی جو گورمکھی رسم الخط میں لکھا کرتے تھے۔ اس کا تعلق بھٹنڈہ کے ایک بنیا خاندان سے تھا اور وہ جٹ قوم اور دیہی علاقوں میں بسنے والے نچلے درمیانی طبقے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے پنجابی زبان کو نثر لکھنے والے بیشتر مصنفین سے بہتر انداز میں استعمال کیا اور پھر اپنی تحریروں کو اس نے ہوش مندی' طنز اور زہریلے مزاج سے چٹخارے دار بنا ڈالا تھا پھر اس کے ساتھ میری ملاقات لاہور کے اس حلقے میں ہوئی ہوگی جسے بائیں بازو کا حلقہ کہا جاتا ہے۔ مجھ سے زیادہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ منسلک تھا۔ اس نے شاید پوسٹر اٹھا رکھا تھا اور میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں گارگی سے بہت پہلے ہی کیمونسٹ پارٹی سے علیحدگی اختیار کر چکا تھا اور ایک غصیلے ناقد کی شکل میں ڈھل چکا تھا۔ گارگی نے کیمونزم کو رد کرنے کے لیے اپنا وقت لیا تھا ہم میں چند ہی قدریں مشترک تھیں۔

ایسا ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہوا کہ ہم دونوں نے خود کو دہلی میں پایا اور یہ کہ ہمیں ایک دوسرے کو مزید بہتر طور سے جاننا پڑا۔ میرے خاندان سے اس کا تعارف میری ماں کا مرہون منت تھا جو صرف گورمکھی پڑھ سکتی تھی۔ گارگی نے اماں کو اپنا کھیل ''لوہا کٹ'' پڑھنے کے لیے دیا اور پھر اسے اپنے ساتھ یہ کھیل دکھانے کے لیے بھی لے گیا۔ وہ سحر زدہ ہو گئی۔ اس کے شوہر یا بچوں کے فقط چند دوست اس کی طرف توجہ کرتے تھے۔ گارگی اماں کا دوست بن گیا اور اسے اماں کے ہاں ہونے والی کافی کی محفلوں میں خوش آمدید کہا جانے لگا۔ وہ ایک شاندار داستان گو تھا اور ہر کسی کو اپنے دام میں پھنسا لیتا تھا۔ شاید

عورتوں کے معاملے میں اس کی کامیابی کی وجہ یہی تھی جن میں سے بیشتر جوان اور حسین تھیں۔ آخر انہیں گارگی میں کیا نظر آتا ہے؟ لوگ پوچھا کرتے تھے ''اس کا قد چھوٹا ہے' دیکھنے میں بھلا ہے۔ عجیب و غریب لباس پہنتا ہے۔ چلتے ہوئے اس کا پچھواڑا اہلتا رہتا ہے جبکہ انداز و اطوار زنانہ ہیں اور پھر ہر وقت اپنے ہاتھوں کو اس طرح سے ملتا رہتا ہے جیسے صابن سے ہاتھ دھو رہا ہو!'' جواب یہ تھا کہ وہ ایک ہمدرد سننے والا تھا اور جب یہ بات عورت کی ہوتی تو راستہ ہموار کرنے کے لیے خوشامد کا بیلچہ استعمال کرنا اسے خوب آتا تھا' ہر عورت اس کے سامنے ایسا محسوس کرتی تھی جیسے وہ شاہ سلیمان کی ملکہ صبا ہو۔

جب میں اسے قدرے بہتر طور پر جاننے لگا تو اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے ایک سکھ دوست کی بیوی کے ساتھ دوستی سے بڑھ کر تعلقات استوار کیے ہوئے تھا۔ سکھ عورتیں گارگی کی اولین ترجیح تھیں۔ اس کے کناٹ پیلس کے عقب میں واقع ایک تنگ سی گلی میں ایک چھوٹے سے کمرے اور تنگ صحن پر مشتمل گھر کے اندر میں ایسی بیسیوں لڑکیوں سے مل چکا تھا جو اسٹیج پر یا فلم میں کام کیا کرتی تھیں۔ ایک پروین بوبی تھی جسے وہ میرے گھر ڈنر کے لیے لے کر آیا کرتا تھا۔ امرتا پریتم' اجیت کور اور اُوما واسودیو جیسی لکھنے والیاں بھی میرے گھر آیا کرتی تھیں۔

اکثر و بیشتر گارگی ملک سے باہر ہی ہوتا تھا کبھی سیاٹل یونیورسٹی (امریکہ) میں ڈرامہ پڑھانے کے لیے اور کبھی گلاسگو (اسکاٹ لینڈ) میں ڈرامہ پیش کرنے کے لیے۔ میں بھی نو سال تک بمبئی سے دور اور ملک سے باہر جاتا رہا۔ سیاٹل میں گارگی نے ایک امریکی بیوی ''جینی'' حاصل کر لی تھی۔ وہ قد میں اس سے چند انچ لمبی تھی اور اس کا حسن پتھرا دینے والا تھا۔ میں پوری طرح اس کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا اور اس چکر میں انہیں بارہا اپنے ہاں کھانے پر بھی بلا چکا تھا۔ جینی ناقابل یقین حد تک معصوم دکھائی دیتی تھی۔ اس میں کھانے کی اشتہا بھی انتہائی زیادہ تھی۔ تین آدمیوں کا کھانا پلک جھپکنے میں صاف کر سکتی تھی۔ گارگی کو اس کی خوفناک بھوک پر شرمندگی بھی اٹھانا پڑی اور وہ غرایا: ''لوگ سمجھتے ہیں کہ اسے گھر پر کچھ کھانے کو نہیں ملتا۔'' جینی کو اس بات کا احساس دلانے کے لیے کہ گارگی ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے کس قدر سراہا جا رہا ہے۔ جینی کا پنجابی سیکھنا ضروری

تھا۔لیکن وہ اس بات کی بالکل پروانہیں کرتی تھی جس کی وجہ سے گارگی کو مزید شرمندگی اٹھانا پڑی۔

جینی نے گارگی کو ایک بیٹی اور ایک بیٹا دیا۔ پھر دونوں کے درمیان رخنے پڑنے لگے' دونوں چندی گڑھ میں مقیم تھے جہاں گارگی یونیورسٹی میں ڈرامہ آرٹ کے پروفیسر کی حیثیت سے تعینات تھا۔گارگی اپنی شاگردوں میں سے ایک کے دام میں آ چکا تھا۔ایک جوان اور پُرکشش طلاق یافتہ شاگرد (یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ سکھ تھی) کے ساتھ وہ اپنے تعلقات کو اپنے سوانحی ناول "The Naked Triangle" میں کھل کر بیان کرتا ہے۔سردیوں کی ایک رات اس نے لڑکی کو اپنی گاڑی میں اس کے گھر اتارنے کا فیصلہ کیا۔ گیراج میں دونوں کو شہوت نے دبوچ لیا اور وہ گیراج کے فرش پر ہی اپنی بھوک مٹانے لگے۔ دونوں کھڑکی میں سے دیکھ سکتے تھے کہ جینی اپنے بچوں کو پیانو بجانا سکھا رہی تھی۔جینی نے گارگی کی اس بیوفائی کو کبھی معاف نہیں کیا اور بالآخر اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

گارگی اپنی ایک نئی گرل فرینڈ کو مجھ سے ملوانے بمبئی میں میرے آفس آن دھمکا۔وہ لڑکی اس پر کافی فریفتہ دکھائی دیتی تھی۔لیکن گارگی ابھی تک تذبذب کا شکار تھا کہ آیا اس نے ٹھیک کیا تھا۔ میں نے جینی کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

اس نئی قربت کو سرد ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی "The Naked Triangle" کی اشاعت تابوت کا آخری کیل ثابت ہوئی۔ جس نے ان کے رشتے کو ختم کر ڈالا۔ناول میں اس کو آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ناول میں جینی کو انتہائی شوخ انداز میں پیش کیا گیا تھا جو کہ وہ نہ تھی میں نے اس کے ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ ناول ایک ایسی شخصیت کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہے جو کبھی گارگی کے بہت نزدیک تھی۔ دوستوں میں یہ افواہ گردش کر رہی ہے کہ یہ عورت گارگی کے صحن میں جا دھمکی اور اس نے گارگی کو ٹھیک ٹھاک گالیوں سے نوازا۔

گارگی اس کڑے امتحان سے بچ نکلا تھا۔اس نے اپنے ناول پر بحث کرنے کے لیے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں کا اجلاس بلایا تھا۔

فقط ایک فرد پر مشتمل اس کے گروہ کی سربراہی مجسمہ ساز' مصور' آرکیٹکٹ ستیش

گجرال نے کی۔ اختتامی تقریر کے دوران گارگی نے اپنی خودی کا کچھ مظاہرہ کیا اور کہا کہ جس عورت کی قربت کا میں لطف اٹھا چکا ہوں اس کے بارے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے' اس کے متعلق لوگ کیا کہتے ہیں مجھے قطعاً کوئی پروانہیں ہے۔ آج سے 50 یا 100 سال بعد ان لوگوں کے بارے میں کون جانتا ہوگا؟ تاہم آنے والی نسلیں میری شخصیت کے قد کو ناپیں گی اور میرے کام کے ادبی معیار کو پرکھیں گی۔

گارگی کو انگریزی زبان میں لکھنے کی طرف مائل کرنے کا سہرا میرے سر ہے۔ ''تم کنویں میں ٹراتے ہوئے ایک مینڈک کی طرح ہو'' میں نے اسے بتایا۔ ''گورمکھی میں لکھی ہوئی تمہاری کتابیں کتنے لوگ پڑھتے ہیں؟ 500؟ 1000؟ اس سے زیادہ نہیں۔ تم انگریزی میں لکھو۔ سارے ہندوستانی تمہیں پڑھیں گے۔ تمہیں دنیا کو دیکھنے کے لیے ایک کھلی کھڑکی مل جائے گی۔''

وہ مان گیا' ہندوستانی تھیٹر پر لکھی اس کی کتاب امریکہ میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ''The Purple Moonlight'' چھپی۔ جو کہ اس کے چھوٹے سے گھر اور صحن کی یادوں پر مشتمل ہے۔

اس کے دوستوں کے ابتدائی خاکوں میں اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے ذہن میں بچھو کا ڈنگ تھا جو نشانہ بننے والوں کو آئندہ سالوں میں تکلیف دیتا رہتا تھا۔ اب اسے کسی کو بھی سخت بات کہنے میں مشکل ہوتی ہے۔ وہ محبت کیے جانے اور سراہے جانے کا خواہاں ہے۔

گارگی کی قسمت ہمیشہ بدلتی رہتی تھی جب بھی وہ بیرون ملک سے واپس آتا تو اس کے پاس خرچنے کے لیے ڈھیروں ڈالر ہوا کرتے۔ وہ گاڑی خریدتا (ایک مرتبہ اس نے بغیر چھت کے سیکنڈ ہینڈ jalopy بھی خریدی۔ دوستوں کو دعوت دیتا' نیا کیمرہ خریدتا' وہ منفرد حد تک اچھا فوٹوگرافر تھا) اور خود کو مصروف رکھتا' پیسے جلد ختم ہو جاتے' گاڑی بیچنا پڑ جاتی۔ اس کے ٹیلی فون اکثر بلوں کی عدم ادائیگی کی وجہ سے بند پڑے رہتے۔ اس نے ایسے زمانے بھی گزارے ہیں کہ اس کے پاس اپنے اکاؤنٹ میں تو درکنار' اپنی جیب میں بھی کوئی پیسہ نہ ہوتا تھا۔ پھر اس کے دوست مدد کے لیے آن پہنچتے۔ اس کی خون میں رچی

مجبوریاں اسے اپنا قرض ادا کرنے پر مجبور کرتی تھیں۔ بنیا ہونے کے ناتے حساب کتاب اس کی رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ دوڑتا تھا۔ پھر وہ ٹی وی کے لیے سیریل بنانے لگتا اور اسے ٹھیک ٹھاک ایڈوانس مل جاتا۔ وہ پھر سے نئی گاڑی خرید لیتا۔ نیا سٹیریو سسٹم اور ایک نیا کیمرہ بھی خریدتا۔ دوستوں کی اعلیٰ شراب اور پُر تکلف کھانوں سے تواضع کی جاتی۔ ایک نئی محبوبہ منظرِ عام پر آتی جو کہ عموماً ایک سردارنی ہی ہوتی۔

گارگی کے ساتھ نبھانا کچھ اتنا آسان کام نہ تھا' دوسرے تخلیقی فنکار اس سے اکثر لڑ پڑتے' اس نے یامنی کرشنا مورتی پر ایک دستاویزی فلم بنائی تھی جو بذاتِ خود ایک خاردار شخصیت تھی۔ بہت سارے روپے اور وقت کے ضیاع کے بعد یامنی گارگی کے کام میں کیڑے نکالنے لگی تھی۔ گارگی کا دل ٹوٹ گیا۔ تاہم جب دونوں میں صلح ہوئی تو یہ یامنی ہی تھی جس نے مجھے اپنے گھر پر فلم دیکھنے کی دعوت دی تھی۔

ایسے ادوار بھی گزرے ہیں جب مجھے گارگی کی مہینوں خبر نہیں ملتی تھی۔ جب وہ فون کر کے کافی پینے کے لیے آیا کرتا تو اسے عام طور پر کوئی نہ کوئی اپنی ہی غرض ہوتی مثلاً کسی نئی فلم یا کتاب پر تبصرہ کروانا ہوتا یا پھر کسی دوست اداکار یا اداکارہ کی تشہیر کرنی ہوتی میں جانتا ہوں کہ وہ تھوڑا سا مطلبی ہے۔ لیکن بلونت گارگی کے علاوہ بمشکل ہی ایسا کوئی دوسرا ہے جس کی آمد کا مجھے انتظار رہتا ہے جو کافی میں اس کو پینے کے لیے پیش کرتا ہوں' وہ اس کا آدھا گگ ضائع کر دیتا ہے۔ لیکن اس ضیاع کے باوجود میرے اندر کے غبار کو خارج کر دیتا ہے۔

اندر سین جوہر

اندر سین جوہر مجھ سے چند سال چھوٹا تھا' وہ لاہور کے ایف سی کالج میں پڑھا کرتا تھا اور ان دنوں اس نے شوقیہ سٹیج کرنے والوں میں ایک مزاحیہ اداکار کی حیثیت سے کچھ نام بنا رکھا تھا۔ ہماری ملاقات ہو چکی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے تھے لیکن ایک دوسرے کو ٹھیک طرح سے جانتے نہیں تھے۔ جب میں لاہور میں وکالت کیا کرتا اور ہائیکورٹ کے سامنے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں مقیم تھا تو مجھے گرمیوں کی ایک شام سڑک پر بینڈ کی آواز سنائی دی جو انتہائی کرخت موسیقی بجا رہا تھا۔ میں اٹھ کر بالکونی تک گیا تاکہ دیکھوں کہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک سفید گھوڑے پر آئی ایس جوہر دولہا بنا بیٹھا تھا۔ وہ راماہنس سے بیاہ رچانے جا رہا تھا جو ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی اور کالج کے ڈراموں میں بھی کام کیا کرتی تھی یہ جوڑا فلمی دنیا میں اپنی قسمت آزمائی کے لیے بمبئی ہجرت کر گیا تھا۔ ان کے دو بچے' ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھے۔

میں نے ہالی ووڈ میں تیار کی گئی انگریزی فلموں سمیت ایسی کچھ فلمیں دیکھی تھیں جن میں جوہر نے اداکاری کی تھی۔ میں اسے کوئی اتنا بڑا اداکار نہیں گردانتا تھا' جب وہ اداکاری سے فلموں کی ہدایت کاری کی طرف آیا جن میں اس نے خود مرکزی کردار ادا کیے تھے تو اس کے اداکارانہ جوہر میری رائے میں مزید پستی میں چلے گئے تھے۔ جب اس کے پاس نئے خیالات کا قحط پڑا تو وہ لوگوں کو چونکا دینے پر اتر آیا تھا۔ ایک فلم میں (میرے

خیال میں شاید "Five Rifles" تھی) اس کی اپنی بیٹی ننگی چھاتیاں لیے پردۂ سکرین پر نمودار ہوئی۔ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ اس نے سنسر والوں کو کس طرح چکمہ دیا تھا۔ اس کی بیوی اس کے طلسم سے آزاد ہو چکی تھی اور اس نے ہربنس نامی اپنے کزن سے شادی کرنے کے لیے اندر سے طلاق حاصل کر لی تھی اور دہلی میں ہیلتھ کم بیوٹی پارلر کھول لیا تھا۔ دوسرے خاوند نے ہر طرح سے اس کا طلسم ختم کر ڈالا تھا' اور وہ اپنا کاروبار فروخت کر کے بمبئی واپس لوٹ گئی تھی۔ اس وقت تک اس کا بیٹا نشے کا عادی بن چکا تھا۔ اس کی بیٹی کی ایک انگریز سے ہونے والی شادی کا انجام بھی کم دھماکہ خیز نہیں تھا۔ کیونکہ اس گورے نے اپنے اکلوتے بیٹے کو ماں سے جدا کیا اور پھر اسے لے کر انگلستان فرار ہو گیا۔ اس وقت تک جوہر بے شمار معاشقے لڑا چکا تھا: راما نے تاج میں ہیلتھ کلب کے منیجر کی نوکری سنبھال لی۔ اس نے جوانی کے کس بل اور دیدہ زیب ادائیں دوبارہ حاصل کر لی تھیں۔ کیونکہ میں ورزش اور ساؤنا باتھ کے لیے روزانہ کلب جایا کرتا تھا۔ اس لیے میری راما سے دوستی ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے فیشل مساجز کے لیے بھی اکسایا تھا۔ جسے میں نے بڑی حد تک ہیجان خیز پایا۔ اس وقت تک راما نے اپنے پہلے خاوند کے ساتھ مقررہ حدود سے ماورا تعلقات قائم کر لیے تھے۔

جوہر کو تشہیر کا بڑا شوق تھا۔ راما اس سے ملنے کے لیے ہفتہ میں ایک بار اس کے ہاں جایا کرتی تھی۔ جب جوہر کو پتا چلا کہ اس نے مجھ سے دوستی بنا لی ہے تو اس نے راما سے مجھے لوئس کورٹ کے اپارٹمنٹ میں مدعو کرنے کے لیے کہا۔ اس وقت میں "دی السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" کی ادارت کر رہا تھا۔ کئی ماہ تک میں معمول کے ساتھ ان کے ہاں رات کے کھانے پر جاتا رہا تھا۔

ساؤنا باتھ لینے کے بعد میں اور راما لوئس کورٹ جانے کے لیے نکل پڑتے۔ راما گھر پہنچ کر جوہر کو فون کیا کرتی جو اس وقت کرکٹ کلب آف انڈیا میں برج کھیل رہا ہوتا تھا۔ راما اسے واپسی پر چائنیز فوڈ لانے کے لیے کہہ دیتی اس دوران میں اندر کی چینی نسل کی کتیا سے کھیلتا رہتا جس کا نام 'پھنو' تھا' چینی تو وہ یقیناً تھی لیکن انتہائی لپٹنے والی بھی تھی۔ کبھی کبھار راما جوہر کے بستر کے ساتھ پڑی میز کی دراز میں سے تصویریں نکال لیا

کرتی جو بکنی یا اس سے بھی کم لباس میں ملبوس ان نوجوان لڑکیوں کی ہوا کرتی تھیں جو فلموں میں کام حاصل کرنے کے چکر میں ہوتی تھیں۔ جوہر چائنیز کھانوں کے ڈبے اٹھائے لوٹتا اور میرے لیے پریمیئم سکاچ کی بوتل نکالا کرتا۔ جوہر اور راما شراب کو ہاتھ بھی نہ لگاتے تھے۔ میں رات کے کھانے سے پہلے تین پیگ کا اپنا کوٹا پورا کر لیتا تھا پھر راما مجھے میرے گھر اتار کر اپنے گھر لوٹ جاتی تھی۔ مجھے کبھی معلوم نہیں ہوا کہ وہ کہاں رہتی تھی۔ جتنا میں جان سکا تھا وہ کچھ اس طرح سے تھا کہ اس نے اپنے دوسرے شوہر سے جان چھڑا لی تھی۔ لیکن میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا اس نے جوہر کے ساتھ صلح کر لی تھی یا نہیں۔ اس بات پر میں اکثر اس کی ٹانگ کھینچتا تھا کہ میں ایک ایسی عورت کو جانتا ہوں جو بیک وقت دو شوہر رکھتی ہے۔

جوہر نے مجھے ''دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' میں سلسلہ وار چھاپنے کے لیے اپنی خودنوشت کا مسودہ بھجوایا تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس میں کتنا سچ تھا اور کتنا اس کے بیمار تخیل کی تخلیق۔ بہرحال ان دنوں جریدوں میں جتنا سیکس چھاپنے کی اجازت تھی' اس کتاب میں اس سے کافی زیادہ تھا۔ اگر جوہر کی بات کا یقین کر لیا جاتا تو اس کے مطابق اس کے جنسی تجربوں کا آغاز بارہ سال کی عمر میں ہو چکا تھا۔ وہ اپنی چھٹیاں اپنے انکل اور اپنی آنٹی کے پاس گزار رہا تھا جن کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک رات اس نے ڈراؤنے خواب دیکھے (یا دیکھنے کا ڈرامہ رچایا) اور نیند میں ایں ایں کرنے لگا۔ اس کی آنٹی اسے اپنے بستر میں لے گئی۔ وہ اس کی چھاتیوں سے لپٹ گیا اور اس نے اپنے عضو تناسل کو تنا ہوا محسوس کیا اس نے اسے اپنی آنٹی میں دھکیلنے کی کوشش کی۔ آنٹی نے اسے ایک تھپڑ رسید کیا اور ہوش کے ناخن لینے کو کہا۔ اگلی صبح وہ ڈرا ہوا تھا کہ کہیں اس کی ڈرگت ہی نہ بنا دی جائے اور اسے واپس اس کے گھر نہ بھجوا دیا جائے۔ تاہم' اس کی آنٹی کا غصہ دور ہو چکا تھا۔ اپنے میاں کے دفتر جانے کی بعد اس نے اندر کو نہلانے کی پیشکش کی۔ جب وہ اس کے جسم پر صابن مل رہی تھی تو ایک مرتبہ پھر اس کی جنسی شہوت نے سر ابھارا۔ اس بار اس کی آنٹی نے اسے بتایا کہ اس کے ساتھ کس طرح نمٹا جائے۔ ہر صبح یہ اس کا معمول بن گیا حالانکہ جوہر نے اعتراف کیا تھا کہ اس نے اپنے لڑکپن میں جس چیز کا بھرپور لطف اٹھایا

تھا وہ بڑے لڑکوں کے ساتھ اس کی مجامعت تھی۔ خودنوشت میں راما کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے علیحدگی کے بعد آنے والے سالوں کے دوران اس نے ایک ابھرتی ہوئی سٹار (جواب ایک سٹار بن چکی ہے) جس کا میں نام نہیں بتاؤں گا' کے متعلق لکھا ہے جسے اس نے مالابار ہلز کے فلیٹ پر رکھا ہوا تھا جب کبھی اسے ضرورت پڑتی وہ اس کے پاس پہنچ جاتا۔ ایک یا دو پیگ چڑھاتا اور پھر اسے بستر پر ڈال لیتا۔ اسی طرح ایک شام اس پر شہوت کا بھوت سوار تھا جب فلیٹ پر پہنچا تو فلیٹ پر موجود گوا کی رہنے والی ایک خادمہ نے اسے بتایا کہ ''میم صاحب باہر گیا۔'' ''کب آئے گا؟'' جوہر نے پوچھا۔ جواب ملا: ''کیا معلوم۔ بہت لیٹ ہوگا۔'' یہ جواب سنتے ہی بس جوہر نے اسی نوکرانی کو بستر پر ڈال لیا اور اس پر چڑھ گیا۔ لڑکی نے احتجاجاً کہا: ''میم صاحب آئے گا تو ہم بولے گا۔'' لیکن ساتھ ہی اپنی میم صاحب کی طرح پیشہ ورانہ مہارت سے ٹانگیں بھی کھول دیں۔